جماعت احمدیہ کی اشاعت اور بنیادی استدلال- عرفان شہزاد صاحب کے اعتراضات کا جواب

راقم : عدیم احمد

ابتدائیہ :

محترم عرفان شہزاد صاحب نے "احمدیت کی اشاعت اور بنیادی استدلالات کا مختصر جائزہ" کے نام سے فیس بُک پر قسط وار ایک مضمون لکھا تھا جو اگست 2018 کے ماہنامہ اشراق میں بھی شائع ہوا ہے. ان کی تقریباً تمام قسطوں کا جواب خاکسار نے دیا تھا جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہاں شائع کیا جاتا ہے.

سب سے پہلے ہم ان کے مضمون کے ابتدائیے پر کچھ تبصرہ کریں گے. اپنے ابتدائیہ میں عرفان شہزاد صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ 'اہل ایمان' نے احمدیوں کے ساتھ جو رویہ رکھا ہے وہ دراصل وہی طرزِ عمل ہے جو منکرین کا انبیاء کی جماعتوں کے ساتھ ہمیشہ سے رہا ہے. انھوں نے قرآن مجید سے حوالے دیئے ہیں کہ دلائل کے مقابل تمسخر اڑانا ہمیشہ اہل باطل کا طرہ امتیاز رہا ہے. اسی طرح ڈرادھمکا کر اپنی ملت میں لوٹانا قوم شعیب کا طریق تھا، سماجی مقاطعہ یعنی بائیکاٹ کفار مکہ کا حربہ تھا، دلیل کے مقابل جلاؤ گھیر اؤ مخالفینِ ابراہیم علیہ السلام کا وطیرہ تھا اور عقیدے کی تبدیلی پر سرکاری پابندی لگانا فرعون کا کام تھا. وہ مزید لکھتے ہیں کہ مسلمان احمدیت کی مخالفت میں ابو جہل، ابو لہب اور فرعون جیسے کردار بن گئے ہیں.

لیکن اس کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ابو جہل و فرعون ہمیشہ انبیاء کے مقابل ہی پیدا ہوا کرتے ہیں. کیا انبیاء کی جماعتوں کے علاوہ بھی کوئی جماعت ہے جس کے مقابل اس درجے کی مخالفت کھڑی ہوئی ہو، پورے پورے

ملک سرکاری سطح پر ان کو نابود کرنے کے درپے ہوں اور وہ پھر بھی مسلسل ترقی کی شاہراہ پر ہوں؟ کیا جماعت احمدیہ کی انبیاء کی جماعتوں سے ایسی کامل مشابہت محض اتفاق ہے؟ کیا کسی اور جماعت کو بھی ایسی مشابہت میسر ہے؟ کیا قرآن مجید میں انبیاء سابقہ کے احوال محض قصے کہانیاں ہیں یا ان میں ہمارے لئے آئندہ کا سبق بھی ہے؟ ان سوالوں کے جوابات درست نتائج تک پہنچنے میں بہت معاون ہوں گے.

ہم قرآن مجید کی روشنی میں کامل ایمان رکھتے ہیں کہ انبیاء اور ان کے مخالفین ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتے ہیں.

علاوہ ازیں عرفان شہزاد صاحب نے علمی دلائل سے قبل دو باتیں فرمائی ہیں اور دونوں ایسی کمزور بنیادوں پر کھڑی ہیں کہ ان کا مطالعہ شدید حیرت میں ڈالتا ہے کہ فاضل ناقد نے اپنے علمی قد کے بر خلاف کیسا ناقص نقد کیا ہے. وہ لکھتے ہیں کہ احمدیت سے متاثر سنجیدہ افراد کے ساتھ مکالمہ و مباحثہ کے بعد انھوں نے کچھ نتائج اخذ کئے ہیں جن پر وہ ایسے تنقید کرتے ہیں گویا جماعت کا مجموعی موقف یہی ہو. حیرت کا مقام ہے! کیا چند افراد کی رائے پوری جماعت کی رائے قرار دی جاسکتی ہے؟ آخر کیوں تنقید سے قبل انھوں نے بانی جماعت اور خلفائے سلسلہ کی ان امور پر رائے جاننا ضروری نہ سمجھا؟ خیر اس بات کو ہم منصف مزاج قاری پر چھوڑتے ہیں. ان میں سے ایک "خواب و مکاشفات" کے تحت ہے اور دوسری انھوں نے "استقامت" کے نام سے تحریر فرمائی ہے.

باب اول: خواب و مکاشفات اور استقامت و ترقی

1- خواب و مکاشفات:

عرفان شہزاد صاحب نے لکھا ہے کہ دیگر صوفی سلسلوں کی طرح احمدیت بھی ایک صوفی سلسلہ ہے. اس لئے یہاں بھی خواب و مکاشفات ہی حق و صداقت کا فیصلہ کُن معیار سمجھے جاتے ہیں. تمام تر دلائل کے بعد گویا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ ہمارے خواب کریں گے.

سب سے پہلے یہ واضح ہو کہ جماعت احمدیہ کے نزدیک حق و صداقت کا فیصلہ کن معیار قرآن و حدیث ہے جبکہ خواب و مکاشفات اس کے بعد تائیدی و تصدیقی حیثیت رکھتے ہیں (یہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وحی زیر بحث نہیں کیونکہ نبی کی وحی بہر حال روایات پر مقدم ہے). لیکن نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عرفان شہزاد صاحب نے چونکہ جماعت کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اپنی اس تنقید کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر رکھی ہے اس لئے ایک صریحاً غلط بات ہماری طرف منسوب کر دی ہے.

اب ان کی اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ "احمدیت بھی ایک صوفی سلسلہ ہے."

در حقیقت اہل المورد کے نزدیک اب مذہب صرف علمی و عقلی تفکر کا نام ہے. ان کے نزدیک خدا سے تعلق قائم تو ہو سکتا ہے لیکن ویسا نہیں جیسا پہلی امتوں میں ہوتا تھا بلکہ تقریباً یک طرفہ تعلق یعنی آپ نمازیں پڑھیں دعائیں کریں لیکن اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ خدا کی طرف سے کوئی رابطہ یا روحانی تجربہ یعنی الہام وغیرہ ممکن نہیں. گویا ان کے نزدیک اسلام کسی فلسفے کا نام ہے جس کی گتھیاں سلجھانا ہی اب مقصود حقیقی ہے. جو شخص اس سے بڑھ کر بات

کرے یعنی خواب و مکاشفات کو بھی مذہب کا لازمہ قرار دے جیسا کہ ہمیشہ سے رہا ہے، وہ ان کے نزدیک صوفی ہے یعنی اس کا اسلام سے تعلق نہیں. یہ بنیادی غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے. ہم انھیں قرآن مجید و احادیث مبارکہ کی طرف بلاتے ہیں کہ وہ مذہب کی تاریخ پر نظر دوڑائیں. غیر انبیاء کے الہامات جو قرآن مجید میں نقل ہوئے ہیں ان پر غور کریں. مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، حضرت مریم اور حوارینِ عیسیٰ کے الہامات.

اسی طرح اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کثرت سے خواب اور مکاشفات ہوتے تھے. احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ روزانہ نماز فجر کے بعد صحابہ سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ کیا کسی نے کل رات کوئی خواب دیکھا؟ اور پھر آپ ﷺ اس کی تعبیر بیان فرما دیتے. (دیکھیں مسلم: 5937)

نیز آنحضرت ﷺ نے بشارت دی ہے کہ اس امت میں بھی محدَّث یعنی صاحبِ الہام پیدا ہوں گے فرمایا پہلی امتوں میں محدَّث ہوتے تھے، میری امت میں ان میں سے ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں. (دیکھیں مسلم: 6204)

اسی طرح حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے الہامات بھی مشہور و معروف ہیں. (دیکھیں دلائل النبوۃ، جامع الاحادیث، کنز العمال، خصائص الکبریٰ)

چنانچہ جہاں ایک طرف علمی و عقلی دلائل اور تفقہ فی الدین کی اہمیت مسلم ہے وہیں دوسری طرف خواب و مکاشفات کے انعام سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا. مذہب کے ہمیشہ دو ہی مقاصد رہے ہیں ایک، اللہ تعالیٰ سے زندہ تعلق اور دوسرا، اس کی مخلوق سے تعلق باقی سب اس طرف لانے کے ذرائع ہیں.

اس لئے جماعت احمدیہ بفضل تعالیٰ اصحاب رسول کے منہاج پر ہے.

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ یہ خواب و مکاشفات ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں جو دوسروں کیلیئے حجت نہیں ہو سکتے. نیز ایسے خواب جب بھی دنیا سے متعلق ہوئے ہیں یعنی ان کے ذریعے پیش گوئیاں کی گئی ہیں، تو ان کی حقیقت کھُل کر سامنے آ گئی ہے.

سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب احمدی خواب اور مکاشفات کو سچائی کی دلیل بناتے ہیں تو ان کے پیش نظر وہ خواب اور مکاشفات ہوتے ہیں جو دنیا سے متعلق ہیں، یعنی پیشین گوئیوں کا رنگ رکھتے ہیں اور جنہیں پرکھا جا سکتا ہے. حضرت خلیفۃ المسیح رابع رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہماری سچائی کی دلیل جو غیروں کے مقابل ہم پیش کرتے ہیں، ایسے خواب ہیں جو پرکھے جا سکتے ہیں نہ ذاتی نوعیت کے.

پھر عرفان شہزاد صاحب نے لکھا ہے کہ بلا امتیاز مسلک و مذہب کچھ روحانی طاقتوں کا حصول ممکن ہے جس سے کسی حد تک درست پیش گوئیاں بھی کی جا سکتی ہیں. اور پیش گوئی کرنے کی صلاحیت بھی بہت سوں میں کسی حد تک ہوتی ہے اور بعض میں غیر معمولی بھی ہو سکتی ہے اور اسے کچھ روحانی مشقوں سے بڑھایا بھی جا سکتا ہے. لہذا تمام صوفیاء اور مرزا صاحب کے الہامات اور پیش گوئیاں خدا کی طرف سے نہیں تھیں بلکہ سب اسی خود فریبی کا شکار رہے.

پہلی بات تو یہ کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے مکاشفات وغیرہ کی خواہش رکھنے کی بجائے اعمال صالحہ پر توجہ دینے کی نصیحت فرمائی ہے. اور دوسرا یہ کہ ہماری روحانی مشقیں نماز و روزہ کے سوا کچھ بھی نہیں. لہٰذا اگر روحانی مشقوں سے آپ کی مراد نماز روزہ ہی ہے تو تمام انبیاء بھی آپ کی تنقید کی زد میں ہیں اور اگر اس کے علاوہ کچھ اور مشقیں ہیں تو جماعت احمدیہ میں ان کا ثبوت آپ کے ذمے ہوا.

گو یہ درست ہے کہ انبیاء و غیر انبیاء کی وحی یکساں نہیں لیکن یقینی اور غیر مبہم الہامات غیر انبیاء کو بھی ہوتے ہیں. ایک عورت آسمان سے آواز سنتی ہے اور اپنے شیر خوار بچے کو دریا کی بے رحم موجوں کے سپرد کر دیتی ہے. یہ تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور یہ ہے غیر انبیاء کی وحی کا معیار.

فاضل ناقد کی یہ تنقید ایک ایسے شخص کی تنقید ہے جو اس میدان میں تجربات نہیں رکھتا ہے. اور مختلف اقسام الہام میں تمیز نہیں کر سکتا سو اس کی سب باتیں اٹکل اور اندازے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں. ہم یہاں ایک ایسے شخص کا جواب پیش کرتے ہیں جو الٰہی مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہے اور خدا کا مسیح و مہدی ہے. "حقیقۃ الوحی" سے ان شبہات کا ازالہ پیش خدمت ہے.

اس تصنیف کا مقصد بیان فرماتے ہوئے آپ علیہ السلام لکھتے ہیں، لوگ ان شبہات میں ہیں کہ کیسے علم ہو کوئی خواب یا الہام خدا کی طرف سے ہے اور شیطان یا نفس سے نہیں. جبکہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو بلا امتیاز مسلک و مذہب کچھ سچے خواب آ جاتے ہیں. اور اس میں ان کے تقویٰ یا تزکیہ کو بھی کچھ دخل نہیں ہوتا. آپ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گو یہ درست ہے کہ سچے خواب بھی شیطانی ہو سکتے ہیں لیکن وہ لوگ جو خدا سے صدق و وفا اور عشق کا تعلق رکھتے ہیں، شیطان ان پر تسلط نہیں پا سکتا. جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو فرمایا ہے کہ "میرے بندوں پر تیرا کچھ تسلط نہ ہوگا." (الحجر: 43)☆ اس کے بعد آپ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو ابھی شیطانی قبضے میں ہیں اپنے الہام بیان کرتے ہیں تا کہ انھیں اپنے مذہب کی سچائی کے ثبوت کے طور پر پیش کریں. اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے خواب بیان کرتے ہیں اور مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ایسے تجارب حق و باطل کا معیار نہیں.

☆ احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے جس پر سب متفق ہیں کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" جو سورۃ توبہ کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں آئی ہے، آیتِ قرآنی ہے۔ شروع سے ہی یہ ہر مصحف میں لکھی گئی جبکہ آیات کی نمبرنگ بہت بعد میں سہولت کے پیشِ نظر ہوئی۔ چنانچہ جماعتِ احمدیہ آیات کو بسم اللہ سے گننا شروع کرتی ہے۔ یوں سورۃ حجر آیت 43، غیر احمدی ترتیب کے مطابق آیت 42 ہوگی بعینہ دیگر آیات کی ترتیب ہے۔

اور اس سے بھی پہلے اپنی کتاب کے دیباچے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے واضح فرمایا ہے کہ خدا کو اپنی قوت سے شناخت نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ خود اپنے تئیں شناخت نہ کروائے۔

بعد ازاں آپ علیہ السلام نے ملہمین کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں:

(1) وہ لوگ جنھیں بعض سچے خواب آ جاتے ہیں یا بعض سچے الہام ہو جاتے ہیں لیکن انھیں خدا سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں مسلک و مذہب کی کچھ تمیز نہیں۔

(2) وہ لوگ جنھیں بعض سچے خواب آتے ہیں یا سچے الہام ہو جاتے ہیں اور انھیں خدا سے کچھ تعلق بھی ہے لیکن کچھ بڑا تعلق نہیں۔

(3) وہ لوگ جو خدا تعالیٰ سے اکمل و اصفی طور پر وحی پاتے ہیں، جنھیں کثرت سے سچے خواب آتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے اکمل و اتم طور پر محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مقام ہمارے سید و مولا حضرت محمد ﷺ کی کامل اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک بنیادی اور اہم نکتہ بیان فرمایا ہے۔ آپؑ لکھتے ہیں کہ انسان چونکہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے خالق کو شناخت کرے اور اس کی ذات و صفات پر ایمان لانے کیلئے کامل یقین پیدا کرے اسی لئے جیسے اللہ تعالیٰ نے انسان کو معقولی قوتیں عطا فرمائی ہیں اسی طرح روحانی قویٰ بھی اس میں رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنوعات باری تعالیٰ اور ان میں موجود حکمت کاملہ کی شناخت کر کے، عقل اس حد تک رہنمائی کرتی ہے کہ اس کائنات کا ایک صانع ہونا چاہئے۔ لیکن کیا وہ درحقیقت موجود ہے، اس کیلئے روحانی قویٰ رکھے گئے ہیں تا مومن کو خدا کی کامل معرفت حاصل ہو۔ لیکن چونکہ انسانی طبیعت میں اخلاقی رذائل کا حجاب پایا جاتا ہے اور وہ عمداً حقوق اللہ و حقوق العباد میں سستی برتتا ہے اس لئے اس کی فطرت اس لائق نہیں کہ قابل قدر مکالمہ و مخاطبہ اسے نصیب ہو۔

لیکن خدا کی عنایت ازلی انسانی فطرت کو ضائع کرنا نہیں چاہتی اس لئے اکثر انسانوں کو کبھی سچے خواب و مکاشفات ہو جاتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ انھیں معلوم ہو کہ ان کیلئے قدم آگے رکھنے کی راہ کھلی ہے اور روحانی ترقی کیلئے ان کے ہاتھ میں ایک نمونہ ہو. نیز تا کہ وہ نبوت کی حقیقت سے بکُلی نا آشنا نہ رہیں اور پاک نبیوں پر ایمان لانے کیلئے ان پر ایک حجت بھی ہو. یہ پہلی قسم کے لوگوں کا حال تھا.

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن میں کسی حد تک زہد و عفت اور استعداد رؤیا کیلئے پائی جاتی ہے. لہٰذا ایک سطحی راستبازی ان میں ہوتی ہے. "اس درجہ کا آدمی اگرچہ بہ نسبت درجہ اوّل کے اپنی خوابوں اور الہامات میں شیطانی دخل اور حدیث النفس سے کسی قدر محفوظ ہوتا ہے لیکن چونکہ اُس کی فطرت میں ابھی شیطان کا حصہ باقی ہے اِس لئے شیطانی القاء سے بچ نہیں سکتا۔ اور چونکہ نفس کے جذبات بھی دامنگیر ہیں اس لئے حدیث النفس سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وحی اور الہام کا کمالِ صفائی، صفائی نفس پر موقوف ہے۔ جن کے نفس میں ابھی کچھ گند باقی ہے اُن کی وحی اور الہام میں بھی گند باقی ہے۔"

تیسری قسم: "جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نہایت کریم و رحیم ہے جو شخص اُس کی طرف صدق اور صفا سے رجوع کرتا ہے۔ وہ اُس سے بڑھ کر اپنا صدق و صفا اُس سے ظاہر کرتا ہے... خدا تعالیٰ میں بڑے بڑے محبت اور وفاداری اور فیض اور احسان اور کرشمۂ خدائی دکھلانے کے اخلاق ہیں مگر وہی اُن کو پورے طور پر مشاہدہ کرتا ہے جو پورے طور پر اُس کی محبت میں محو ہو جاتا ہے۔"

اس درجے کے ملہم دیگر لوگوں کی نسبت نمایاں فرق رکھتے ہیں. ان میں سے چند ایک امتیازات یہاں درج کئے جاتے ہیں:

(1) اس مقام پر ملہم کو ایسا پُر شوکت کلام عطا ہوتا ہے جس میں وسیع، عالمگیر اور یقینی پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں جو باعتبار کمیت و کیفیت بے نظیر ہوتی ہیں. ان کا پورا نہ ہونا ناممکنات میں سے ہوتا ہے.

(2) استجابت دعا بھی ان کا ایک بڑا نشان ہے. نہ عام باتوں میں بلکہ عظیم الشان امور میں کثرت سے ان کی دعا قبول کی جاتی ہے لیکن کبھی خدا دعا رد کر کے اپنی مشیت بھی ان سے منواتا ہے تا ان کی عبودیت ظاہر ہو.

(3) غیر معمولی طور پر خدائی تائیدات ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ ہر ایک مخالف پر غالب آتے ہیں.

(4) کلام خدا کے معارف صحیحہ ان پر کھولے جاتے ہیں.

"اور پھر اس جگہ ایک اور نکتہ قابلِ یادداشت ہے اور وہ یہ کہ تیسری قِسم کے لوگ بھی جن کا خدا تعالیٰ سے کامل تعلق ہوتا ہے اور کامل اور مصفّا الہام پاتے ہیں قبول فیوض الٰہیہ میں برابر نہیں ہوتے اور ان سب کا دائرۂ استعداد فطرت باہم برابر نہیں ہوتا بلکہ کسی کا دائرہ استعداد فطرت کم درجہ پر وسعت رکھتا ہے اور کسی کا زیادہ وسیع ہوتا ہے."

(نوٹ: واوین میں "حقیقۃ الوحی" سے اقتباسات ہیں.)

2- استقامت وترقی :

عرفان شہزاد صاحب لکھتے ہیں کہ خواب و مکاشفات کے بعد احمدی اپنی صداقت کی دوسری شہادت یہ پیش کرتے ہیں کہ مخالفت و جارحیت کے باوجود ان کی استقامت اور تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے. وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات ہمیشہ برحق ہونے کا نشان نہیں ہوتی بلکہ حق و صداقت کا معیار صرف علمی و عقلی دلائل ہیں. کیونکہ یہ ایک نفسیاتی رد عمل ہے کہ جب بھی کسی اقلیتی گروہ پر ظلم کیا جاتا ہے تو ان میں مزاحمت اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی گروہی عصبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے. اس کیلئے انھوں نے یہودیوں کی مثال بھی دی ہے کہ جب تک وہ مصر میں فرعون کے ظلم کا

شکار رہے، پکے موحد اور متحد رہے. جیسے ہی آسودگی نصیب ہوئی، ان میں شرک اور اختلافات در آئے. اس لئے جماعت احمدیہ کی کل عالم میں اشاعت، روز بروز بڑھتی تعداد اور شدید مخالفت کے باوجود استقامت اس کی صداقت کا معیار نہیں ہو سکتی.

اول، اگرچہ خواب و مکاشفات اور استقامت و ترقی بھی ہماری صداقت کے شواہد ہیں لیکن فاضل ناقد کی بیان کردہ ترتیب سراسر غلط ہے. دوم، ہمیں اس حصر سے بھی اختلاف ہے کہ صرف علمی و عقلی دلائل ہی صداقت کا معیار ہیں کیونکہ جماعت احمدیہ کا دعویٰ الٰہی جماعت ہونے کا ہے. اس لئے قرآن مجید میں الٰہی جماعتوں کیلئے بیان کردہ معیارِ حق و صداقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے. گو یہ درست ہے کہ ظلم اور اس کے نتیجے میں استقامت اور ترقی ہمیشہ ہی ہر ایک جماعت کیلئے برحق ہونے کی نشانی نہیں ہوتی لیکن قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے معاملے میں یہ بھی ایک اہم علامت حق شناسی کی ہوا کرتی ہے. کیونکہ نبی کی جماعت کی استقامت و ترقی اول تو ہر ایک مظلوم جماعت جیسی نہیں ہوتی بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے اور دوم، اس کی استقامت و ترقی کے پیچھے خدائے تعالیٰ کی پیشین گوئیاں کھڑی ہوتی ہیں. جیسا کہ فرمایا:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِىْ (المجادلة:22)

"اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ ضرور مَیں اور میرے رسول غالب آئیں گے."

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو مصائب اور کمزوری کے وقت تائید و غلبے کی خوشخبری دیتا ہے. چنانچہ ہمارے سید و مولا حضرت محمد ﷺ کو اس وقت تائید و نصرت اور غلبے کی بشارات سنائی گئیں جب اس چھوٹی سی جماعت کا وجود ہی خطرے میں تھا. کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس قلیل جماعت کی استقامت، ترقی اور قیصر و کسریٰ جیسی عظیم سلطنتوں پر غلبہ، قرآن و حدیث میں مذکور پیشین گوئیوں کی بنا پر آنحضرت ﷺ کی صداقت کا معیار نہیں؟ یقیناً ہے. پس یہی سنت

اللہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے غلامِ صادق حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے ساتھ بھی دہرائی گئی. اس سے پہلے کہ ہم پیشین گوئیاں نقل کریں، یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مثیلِ مسیح ہونے کا دعویٰ کتاب فتح اسلام میں فرمایا جو 1890 کے آخر میں لکھی گئی اور 1891 کے اوائل میں چھپی. تب بالکل چھوٹی سی جماعت آپ کی بیعت میں تھی.

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی بے شمار پیشین گوئیاں ہیں. ہم یہاں اختصار کے ساتھ چند ایک نقل کریں گے.

- سنہ 1883 یہ وہ دور تھا جب آپ کی بیعت میں ایک بھی شخص نہ تھا. اس دور میں انگریزی زبان میں الہام ہوا: (واضح رہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام انگریزی زبان سے بالکل نابلد تھے)

"آئی شَیل گِو یُو اِے لارج پارٹی اَوف اِسلام"

"I shall give you a large party of Islam"

ترجمہ: مَیں تمہیں ایک بڑا گروہ اِسلام کا دوں گا.

پھر بعد اس کے یہ الہام ہے:

" ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ "

پہلوں میں سے بھی ایک گروہ ہے اور پچھلوں میں سے بھی ایک گروہ ہے. (یعنی پہلے انبیاء کی امتوں میں سے بھی ایک گروہ کثیر تم پر ایمان لائے گا اور مسلمانوں میں سے بھی ایک بڑی جماعت تم پر ایمان لائے گی.)

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ 556، 557حاشیہ در حاشیہ نمبر 4روحانی خزائن جلد نمبر 1 صفحہ 664، 665) (تذکرہ صفحہ 81-80)

- سنہ 1886 میں یہ الہام ہوا، اس دور میں بھی آپ کی بیعت میں کوئی شخص نہ تھا:

"میں تیرے خالص اور دلی محبوں کا گروہ بھی بڑھاؤں گا اور ان کے نفوس و اموال میں برکت دُوں گا اور اُن میں کثرت بخشونگا."

(از اشتہار20/فروری1886ء۔ تبلیغِ رسالت جلد اوّل صفحہ 60،62۔ مجموعہ اشتہارات جلد اوّل صفحہ 102، 103) (تذکرہ صفحہ 112)

- سنہ 1889 میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیعت لینے کا اذن عطا ہوا. 23مارچ1889 کو آپ علیہ السلام نے 40افراد سے پہلی بیعت لی. اس سے 19 دن پہلے 4مارچ کو آپ نے ایک اشتہار شائع فرمایا جس میں یہ عظیم الشان پیش گوئی درج فرمائی:

"وہ جیسا کہ اس نے اپنی پاک پیشینگوئیوں میں وعدہ فرمایا ہے اس گروہ کو بہت بڑھائے گا. اور ہزار ہا صادقین کو اس میں داخل کرے گا. وہ خود اس کی آبپاشی کرے گا اور اس کو نشوونما دے گا یہاں تک کہ ان کی کثرت اور برکت نظروں میں عجیب ہو جائے گی. اور وہ اس چراغ کی طرح جو اونچی جگہ رکھا جاتا ہے دنیا کی چاروں طرف اپنی روشنی کو پھیلائیں گے اور اسلامی برکات کیلئے بطور نمونہ کے ٹھہریں گے." (مجموعہ اشتہارات، جلد نمبر1، صفحہ 193)

- سنہ 1897 کے الہامات میں سے یہ دو الہام ملاحظہ فرمائیں:

(1) گو یہ الہام 1897 کا چھپا ہوا ہے لیکن حضور علیہ السلام نے اس پر تحریر فرمایا ہے کہ:

ایک عرصہ ہوا کہ مجھے الہام ہُوا تھا:

" وَسِّعْ مَكَانَكَ۔ يَأْتُوْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ "

یعنی اپنے مکان کو وسیع کر کہ لوگ دُور دُور کی زمین سے تیرے پاس آئیں گے.

(اشتہار موٴرخہ 17/ فروری 1897ء۔ مجموعہ اشتہارات جلد2 صفحہ327) (تذکرہ صفحہ 246)

(2) "عالَمِ کشف میں مَیں نے دیکھا کہ زمین نے مجھ سے گفتگو کی اور کہا:۔

يَاوَلِيَّ اللّٰهِ كُنْتُ لَآ اَعْرِفُكَ

یعنی اے خدا کے ولی! مَیں تجھ کو پہچانتی نہ تھی۔"

(سراج منیر صفحہ 78۔ روحانی خزائن جلد12 صفحہ 80) (تذکرہ صفحہ 249)

- سنہ 1898 میں یہ الہام ہُوا:

"مَیں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہونچاؤں گا."

(الحکم جلد2 نمبر6،5 موٴرخہ 27/ مارچ و2/ اپریل 1898ء صفحہ 13)

(الحکم جلد2 نمبر25،24 موٴرخہ 27،20/ اگست 1898ء صفحہ 14) (تذکرہ صفحہ 260)

- سنہ 1902 میں یہ عظیم الشان پیش گوئی فرمائی:

"دیکھو وہ زمانہ چلا آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ خدا اِس سلسلہ کی دُنیا میں بڑی قبولیت پھیلائے گا اور یہ سِلسلہ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں پھیلے گا اور دنیا میں اسلام سے مراد یہی سلسلہ ہو گا۔ یہ باتیں انسان کی باتیں نہیں یہ اُس خدا کی وحی ہے جس کے آگے کوئی بات اَنہونی نہیں۔"

(روحانی خزائن جلد 17، تحفہ گولڑویہ صفحہ 182)

یہ سب الہامات ابتدائی دور کے ہیں اور بہت سے جیسا کہ ذکر کیا گیا ایسے وقت کے ہیں جب ایک بھی شخص آپ پر ایمان نہیں لایا تھا اور قادیان میں بھی بہت سے آپ کو نہیں جانتے تھے اور پھر یہ الہامات اسی وقت شائع بھی کر دیئے گئے تھے. باقی الہامات بھی ابتدائی دور کے ہیں جب ایک قلیل جماعت آپ کے ساتھ تھی جسے لوگوں تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بناتے تھے. پس ایسے وقت میں یہ عظیم الشان پیشین گوئیاں کیا معمولی بات ہے؟ کیا یہ انسان کا کام ہے؟ یقیناً نہیں. سو جیسے پہلے انبیاء اور ان کی جماعتوں کی استقامت اور ترقی، الٰہی پیشین گوئیوں کی بنا پر ان کی صداقت کا معیار رہی ہے ویسے ہی جماعت احمدیہ کیلئے بھی یہ معیارِ صداقت ہے.

باب دوم: تسلسل نبوت

عرفان شہزاد صاحب نے علمی دلائل کے تحت سب سے پہلے تسلسل نبوت کی آیات پر بحث کی ہے. انھوں نے اپنے نقد کی ابتدا سورۃ اعراف کی آیت 36 سے کی ہے.

1- امت محمدیہ میں انبیاء کی خوشخبری:

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصۡلَحَ فَلَاخَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَاہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَاسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡہَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿الاعراف:37-36﴾

"اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمھی میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی، ان کیلئے نہ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو میری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گی، وہی دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔" (تدبر قرآن)

فاضل ناقد لکھتے ہیں: "احمدی حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں خدا تمام بنی آدم سے مخاطب ہو کر رسولوں کی آمد کی خبر دے رہا ہے. چنانچہ جب تک بنی آدم دنیا میں موجود ہیں، رسول بھی آتے رہیں گے."

آگے لکھتے ہیں: "اس آیت میں غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہے کہ رسول آتے رہیں گے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اگر" رسول آئے تو تمھارا رویہ کیا ہونا چاہئے. اگر یہ کہنا ہوتا کہ رسول مسلسل آتے رہیں گے، تو اس کیلئے یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا."

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ جب آیت خاتم النبیین سے نبیوں کا آنا موقوف ہو گیا تو خدا کو اس آیت کے تحت پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نبیوں کی آمد کا امکان بنائے رکھے.

یہاں فاضل ناقد کو دو باتوں میں غلطی لگی ہے. ایک تو اس آیت کی تفہیم میں اور دوسری اس آیت کو اپنے تصور ختم نبوت کی روشنی میں سمجھنے میں. پہلے دوسرے نکتے پر بات کرتے ہیں.

عرفان شہزاد صاحب نے اپنے مضمون میں یہ ترتیب اختیار کی ہے کہ پہلے عمومی طور پر تسلسل انبیاء کی آیات پر بحث کی ہے، اس کے بعد کسی خاص نبی / مسیح کے آنے کے قرآنی امکان پر بات کی ہے اور آخر میں آیت خاتم النبیین سے نتیجہ اخذ کیا ہے. یہ بالکل درست ترتیب ہے. لیکن سورۃ اعراف کی اس آیت پر بحث کرتے ہوئے ان سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ آیت خاتم النبیین سے اخذ کردہ جس نتیجے کو ثابت کرنا تھا اسی کو ثبوت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں. اگر یہی کرنا تھا تو ان پہلے دو حصوں کی ضرورت ہی کیا تھی، ان پر کیوں صفحے کے صفحے سیاہ کئے گئے؟ تب تو انھیں چاہیے تھا کہ صرف آیت خاتم النبیین پر بحث کرتے اور نتیجہ نکال لیتے. اور اس کے بعد یہ لکھ دیتے کہ دوسری ہر آیت کو ہمارے اس نتیجے کے تناظر میں دیکھا جائے. لیکن اگر انھوں نے ایک ترتیب قائم کی تھی تو چاہیئے تھا کہ اس کا لحاظ بھی رکھتے. اس سے ان کے استدلال کی کمزوری واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس آیت خاتم النبیین کے علاوہ کوئی آیت ثبوت کیلئے موجود نہیں اور دوسری بہت سی آیات ان کے تصور ختم نبوت سے میل نہیں کھاتیں اس لئے ان آیات کو آیت خاتم النبیین سے منسوخ قرار دینا پڑتا ہے. خیر اصل مضمون کی طرف بڑھتے ہیں.

اب اس آیت کی درست تفہیم بیان کی جاتی ہے. سورۃ اعراف کی مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے دراصل سورۃ بقرۃ کی آیت 39 اور 40 (اور طٰہ کی آیات 124 اور 125) میں موجود حکم کو کچھ اضافے کے ساتھ نئے سرے سے دہرایا ہے. سورۃ بقرۃ میں مذکور یہ حکم تب صادر ہوا جب بنی آدم میں سلسلہ نبوّت کی ابتدا کی جا رہی تھی، فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿البقرة:40-39﴾

"ہم نے کہا: اترو یہاں سے سب! تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو، وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔" (تدبر قرآن)

غامدی صاحب کے استاذ امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: " فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّيْ هُدًى (تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت) : یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لئے نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔" آیات کا یہ مفہوم ہمیشہ سے متفق علیہ ہے.

اب ہم ان آیات پر عرفان شہزاد صاحب کی اوپر بیان کی گئی تنقید ہو بہو لا کو کرتے ہیں: "اس آیت میں غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہے کہ ہدایت آتی رہے گی، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ "اگر" ہدایت آئے تو تمھارا رویہ کیا ہونا چاہیئے. اگر یہ کہنا ہوتا کہ ہدایت مسلسل آتی رہے گی، تو اس کیلئے یہ اسلوب اختیار نہ کیا جاتا."

اب میں ہر منصف مزاج قاری سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا کسی کو بھی یہ نتیجہ قبول ہو گا؟ جبکہ اسلوب بھی وہی ہے اور بات بھی وہی جو سورۃ اعراف میں بیان ہوئی ہے. ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ بنی آدم میں سلسلہ انبیاء جاری فرمانے کی نوید سنا رہا ہے.

بعینہ یہی بات قیامت تک آنے والے تمام اہلِ ایمان بنی آدم کو مخاطب کر کے سورۃ اعراف میں دہرائی گئی ہے. سو جیسے یہاں ہدایت کے مسلسل آنے کی نوید ہے نہ کہ کسی رویے کی بات ہو رہی ہے، بالکل ویسے ہی سورۃ اعراف میں

بھی مسلسل رسولوں کے آنے کی نوید ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سورۃ بقرۃ میں عمومی طور پر ہر قوم سے رسولوں کا آنا بیان فرمایا تھا جبکہ سورۃ اعراف میں یہ بشارت صرف آنحضرت ﷺ کی امت کیلئے ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہاں بھی بنی آدم کے الفاظ ہی آئے ہیں لیکن سیاق وسباق سے واضح ہے کہ مخاطب صرف مسلمان ہیں (دیکھیں آیت 32)۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب جو رسول آئیں گے امت محمدیہ میں سے ہی آئیں گے۔ نیز ساتھ یہ اضافہ بھی فرمادیا کہ اب جن رسولوں کے آنے کی بشارت دی جاتی ہے وہ "میری آیات پڑھتے ہوئے" آئیں گے۔ اس خاص سیاق و سباق میں آیات سے مراد قرآنی آیات ہیں۔ چنانچہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسول قرآن مجید کی ہی تعلیم دیں گے نہ کہ اس کے مقابل کوئی اور کتاب لائیں گے، غیر تشریعی اور آنحضرت ﷺ کے متبعین ہوں گے جیسا کہ تسلسل انبیاء کی دیگر آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے جن کا ذکر آئندہ اقساط میں کیا جائے گا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ سورۃ بقرۃ میں اس ہدایت کے ساتھ "اگر" کا لفظ کیوں ہے یعنی جملہ شرطیہ کیوں ہے؟ اور جملہ شرطیہ کی جو مثال فاضل ناقد نے بیان کی ہے وہ کسی طرح بھی آیات مذکورہ سے میل نہیں کھاتی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر وہ لاہور آئے تو فلاں شخص سے ملیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہو سکتا ہے وہ آئیں یا شاید نہ آئیں۔ لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ شاید ہدایت آئے یا شاید نہ آئے کیونکہ اگر یہ مطلب لیا جائے تو آیت کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جو کہ سلسلہ نبوّت جاری کرنا ہے۔ شرطیہ ہونے کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ اگر تم اس نبی کے زمانے کو پاؤ۔ یعنی ہدایت تو مسلسل آتی رہے گی لیکن اگر تم اسے پاؤ تو قبول کرنا رد نہ کر دینا۔

بعینہ یہی حکم یہاں سورۃ اعراف میں بھی ہے۔ اب امت محمدیہ کیلئے نبوت کے اس اجرا کی تجدید کی گئی ہے۔ تاکہ انھیں یاددہانی ہو کہ ان کیلئے بھی وہی حکم ہے جو ہمیشہ سے بنی آدم کیلئے رہا ہے۔ بہرحال آیت زیرِ بحث سے تسلسل نبوت صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔

2- آنحضرت ﷺ کی اتباع: نبوت کی بنیادی شرط

(گو عرفان شہزاد صاحب نے اپنے مضمون میں اس آیت پر بحث نہیں کی لیکن چونکہ یہ ہمارے استدلال کی بنیادی آیات میں سے ہے، اس لئے پیش کی جاتی ہے.) سورۃ نساء کی آیت 70 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿النساء:70﴾

"اور جو بھی اللہ کی اور اِس رسول کی اطاعت کرے گا تو یہی وہ لوگ ہیں جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے (یعنی) نبیوں میں سے، صدیقوں میں سے، شہیدوں میں سے اور صالحین میں سے. اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں."

"اس آیت میں بہت سے قابل توجہ امور ہیں. پہلا یہ کہ الرسول سے مراد آنحضرت ﷺ ہیں یعنی یہ خاص رسول. دوسرا یہ کہ اگر تم اس رسول کی اطاعت کروگے تو ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جن میں نبی بھی شامل ہیں اور صدیق بھی اور شہید بھی اور صالح بھی. اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متابعت میں نبی بھی آسکتا ہے، یعنی وہ جو اِس رسول کی اطاعت کرنے والا ہو..."

(قرآن کریم اردو ترجمہ مع سورتوں کا تعارف اور مختصر تشریحی نوٹس، حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابعؒ)

ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں معیت و رفاقت کا مطلب یہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے متبعین گزشتہ امتوں کے انعام یافتہ لوگوں کے محض ساتھ ہوں گے اور خود یہ انعامات حاصل نہیں کریں گے بلکہ یہ مفہوم ہے کہ یہ انہی میں سے ہوں گے. ہمارے اس نقطہ نظر کی تائید درج ذیل نکات سے ہوتی ہے:

اول، یہاں مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِم کے بعد مِّنَ النَّبِیّٖن فرمایا گیا ہے. یہ مِنْ بیانیہ کہلاتا ہے، مراد ہے ان کے ساتھ یعنی ان میں سے.

دوم، لغت سے بھی مع کے ان معنوں کی تصدیق ہوتی ہے. امام راغب نے مفردات القرآن میں مع کے تحت یہ پانچ معانی درج کئے ہیں:

مع مکانی، مع زمانی، مع معنوی یعنی رشتے میں معیت، مرتبے میں معیت اور مع بمعنی نصرت

ہمارے نزدیک اس آیت مبارکہ میں درجے اور رتبے میں معیت مراد ہے. امام راغب کی بھی یہی رائے ہے:

"راغب نے کہا ہے یعنی ان چار گروہوں کے ساتھ درجہ اور ثواب میں شامل کر دے گا جن پر اس نے انعام کیا ہے. اس طرح کہ جو تم میں سے نبی ہو گا اس کو نبی کے ساتھ ملا دے گا اور جو صدیق ہو گا اسے صدیق کے ساتھ ملا دے گا اور شہید کو شہید کے ساتھ ملا دے گا اور صالح کو صالح کے ساتھ ملا دے گا." (تفسیر بحر المحیط جلد 3 صفحہ 287)

سوم، قرآن مجید سے بھی مع کے اس معنی کی تصدیق ہوتی ہے:

سورۃ آل عمران کی آیت 194 میں فرمایا:

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿آل عمران:194﴾

اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔

یعنی اس حال میں موت دے کہ ہم تیرے وفادار بندوں میں شامل ہوں نہ یہ کہ جب تیرے وفادار بندے فوت ہوں تو ساتھ ہی ہمیں بھی وفات دے دے.

سورۃ النساء کی آیت 147 میں فرمایا:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِیْنَہُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَ سَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿النساء:147﴾

البتہ جو توبہ اور اصلاح کر لیں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کیلئے خالص کر لیں گے، وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ ایمان والوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

یعنی توبہ کرنے والے خود مومنین بن جاتے ہیں نہ کہ صرف پہلے مومنوں کے ساتھ ہوتے ہیں.

سورۃ الحجر کی آیت 32 میں لکھا ہے:

اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿الحجر:32﴾

مگر ابلیس نے انکار کر دیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو۔

یعنی سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے مراد ان میں سے ایک ہونا ہے.

کہا جا سکتا ہے کہ جب مع میں اور معانی بھی پائے جاتے ہیں تو معیت مرتبہ پر ہی اصرار کیوں؟ درج ذیل اسباب دوسرے کسی معنی کیلئے راہ نہیں چھوڑتے:

اول، اس آیت مبارکہ میں جملہ اسمیہ استعمال ہوا ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف آخرت میں آنحضرت ﷺ کے متبعین کو انعام یافتوں کا ساتھ میسر آئے گا بلکہ اس دنیا میں بھی ان منعمین کی معیت ثابت ہوتی ہے. چنانچہ دنیا میں ساتھ سے مراد ان کا مرتبہ پانا ہی ہو سکتا ہے.

دوم، سب سے اہم اور فیصلہ کن امر یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی ہمارے ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے اور ہر دوسرے معنی کی تردید کر دیتا ہے. سورۃ الحدید کی آیت 20 میں لکھا ہے:

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖۗ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿الحدید:20﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر، وہی لوگ اپنے رب کے ہاں، صدیقوں اور شہداء کے زمرے میں ہوں گے. ان کیلیئے ان کا صلہ بھی ہو گا اور ان کی روشنی بھی۔ رہے وہ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی، وہ جہنم والے بنیں گے۔

امین احسن اصلاحی صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"منافقین کو ایک تنبیہ: یہ منافقین کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ ہر مدعیٔ ایمان کو نہیں حاصل ہو جائیں گے بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے اور اپنے عمل سے اپنے دعوائے ایمان کی صداقت ثابت کریں گے.. اور وہی لوگ ہیں جن کو صدیقین اور شہداء کے زمرے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو گی.. بعینہٖ یہی بات ان منافقین ہی کو خطاب کر کے سورۂ نساء میں یوں فرمائی گئی ہے: وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ (النساء ۴: ۷۰) "اور جو پوری وفاداری سے اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہی لوگ اللہ کے انعام یافتوں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔"

ہم اس سے زائد کیا کہتے ہیں؟ ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر صحیح معنوں میں ایمان لائیں گے اور پوری وفاداری سے اطاعت کریں گے، انھیں انعام کے حصول میں انہی لوگوں کی معیت حاصل ہو

جائے گی. آیت مذکورہ بالا نے اس کی تصریح کر دی ہے. اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فضیلت صرف ہمارے سید و مولا حضرت محمد ﷺ کے حصے میں آئی ہے کہ ان کی اتباع سے نبوت کا مقام بھی عطا کیا جاتا ہے. دراصل، یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی تفسیر ہیں اور ایک کا اجمال یا بظاہر ابہام دوسری سے زائل ہو جاتا ہے. امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

"ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے، دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے، ایک جگہ اُس کا اصل رخ غیر معین ہوتا ہے، دوسرے سیاق وسباق میں وہ رخ بالکل معین ہو جاتا ہے۔ بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے، دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی، لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔ قرآن کا یہ اسلوب، ظاہر ہے کہ اِسی مقصد کے لیے ہے کہ اِس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے۔" (تدبر قرآن 1/28)

سوم، اس وجہ سے بھی ہم آیت زیرِ بحث میں معیت و رفاقت کا معنی محض ساتھ نہیں کر سکتے کیونکہ اُس صورت میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی کامل اطاعت کرنے والے نبیوں کے ساتھ ہوں گے مگر خود نبی نہ ہوں گے. وہ صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہوں گے لیکن خود صدیق، شہید اور صالح نہ ہوں گے. یہ معنی خلاف قرآن ہیں اور ان سے حضور اکرم ﷺ کی ہتک بھی ہے.

غرض یہ آیت مبارکہ بھی آنحضرت ﷺ کی اتباع میں انبیاء کا آنا ثابت کرتی ہے.

3- آئندہ انبیاء پر ایمان لانے کے متعلق امت مسلمہ سے عہد:

سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۞ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿آل عمران:83-82﴾

"اور جب اللہ نے نبیوں کا میثاق لیا کہ جبکہ میں تمھیں کتاب اور حکمت دے چکا ہوں پھر اگر کوئی ایسا رسول تمھارے پاس آئے جو اس بات کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لے آؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے. کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس بات پر مجھ سے عہد باندھتے ہو؟ انھوں نے کہا (ہاں) ہم اقرار کرتے ہیں. اس نے کہا پس تم گواہی دو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں. پس جو کوئی اس کے بعد پھر جائے تو یہی ہیں جو فاسق ہیں." (ترجمہ حضرت مرزا طاہر احمد رحمہ اللہ)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نبی سے اس کی قوم کی نمائندگی میں اس بات پر عہد لیا گیا ہے کہ وہ آنے والے رسولوں پر ایمان لائیں گے. (آنحضرت ﷺ سے بھی یہ عہد لیا گیا ہے دیکھیے سورۃ احزاب آیت 8. جس سے آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نبیوں کا آنا ثابت ہوتا ہے.) یہاں مقصود اہل کتاب کو اس عہد کی یاددہانی ہے جس کے مطابق آنحضرت ﷺ اُن پیش گوئیوں کا مصداق بن کر تشریف لائے جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں.

عرفان شہزاد صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصدر مفعول کی طرف اضافت ہے یعنی نبیوں سے نہیں بلکہ ان کی قوموں سے عہد لیا گیا ہے. کیونکہ تمام تر سیاق وسباق میں بنی اسرائیل سے

ہی خطاب ہے. پھر نبیوں کا بعثت محمدی کے وقت موجود ہونا ناممکنات میں سے ہے تو لا محالہ عہد ان کی قوم سے ہی ہوا. علاوہ ازیں، عہد کی پاسداری نہ کرنے پر جو لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ نبیوں کے ساتھ موزوں نہیں.

اس استدلال میں یہ تصور کیا گیا ہے کہ اگر عہد نبی سے لیا گیا ہو تو اس کی قوم اس عہد سے خارج ہو جاتی ہے جس سے وہ مسائل جنم لیتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے. یہی بنیادی غلط فہمی ہے. قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ بظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہوتا ہے لیکن اس حکم میں تمام لوگ شامل ہوتے ہیں. مثلاً سورۃ طلاق آیت 2 میں فرمایا يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ یعنی اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو. یہاں گو خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن اگلے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس حکم میں تمام مسلمان شامل ہیں. اس خطاب کی اہمیت میں امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

"نبی صلعم سے خطاب کی اہمیت: تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب شخصاً نہیں بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کو خطاب کرنے کے بعد معاً 'طَلَّقْتُمْ' میں ضمیر خطاب جمع آگئی ہے جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ ہیں تو تمام مسلمانوں کے لیے البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ احکام دینے سے ان کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بہت بڑھ گئی ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر ان کی عظمت کا احساس پیدا ہو کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان باتوں کی پابندی لازمی ہے تو دوسروں پر تو بدرجہا زیادہ ہو گی۔"

بعینہ یہی اسلوب زیر بحث آیات میں اختیار کیا گیا ہے اور انبیاء سے خطاب کا مقصد بھی یہی ہے. یعنی اگرچہ عہد نبیوں سے لیا گیا ہے لیکن اپنی قوم کے وکیل کی حیثیت سے اور اصل خطاب قوم کو ہی ہے جیسا کہ بعد کے الفاظ سے ظاہر

ہے. دوسرے لفظوں میں، انبیاء کے ذریعے ان کی قوموں سے عہد لیا گیا ہے. اس طرح وہ تمام دشواریاں آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہیں جن کا ذکر عرفان شہزاد صاحب نے کیا ہے اور قرآن مجید کا اسلوب بھی قائم رہتا ہے.

اب آتے ہیں دوسری آیت مبارکہ کی طرف جس میں آنحضرت ﷺ سے بھی یہ عہد لینے کا تذکرہ ہے. سورۃ احزاب میں فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْکَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ۙ﴿﴾ لِّیَسْئَلَ الصّٰدِقِیْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَ اَعَدَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿الاحزاب:9-8﴾

اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا عہد لیا اور تجھ سے بھی اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے. اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا تھا. تاکہ وہ سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے اور کافروں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کیا ہے. (ترجمہ از حضرت مرزا طاہر احمد رحمہ اللہ)

کہا جاتا ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق اجازت نہیں دیتا کہ یہاں وہی عہد مراد لیا جائے جو سورۃ آل عمران میں مذکور ہے. مثلاً اگلی ہی آیت میں فرمایا ہے کہ تاکہ خدا سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے. یہ سوال اتمام حجت کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے. چنانچہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں انبیاء سے اس بات کا عہد لیا گیا ہے کہ وہ پیغام خداوندی کو بے کم و کاست پہنچائیں گے.

ہمارا موقف یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں دو جگہ ہی میثاق النبیین کا ذکر ہے. ایک سورۃ آل عمران میں اور دوسرا اس آیت میں. اس لئے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو دونوں جگہ ایک ہی عہد مراد ہونا چاہئے. جیسا کہ ہم واضح کئے دیتے ہیں. آل عمران میں مذکور میثاق کا مدعا بتمام و کمال اس آیت پر بھی لاگو ہوتا ہے اور یہ سیاق و سباق سے متعارض بھی

نہیں ہے. یہاں کافروں اور منافقوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ جس نبی کی تکذیب و تحقیر کے تم مرتکب ہوتے ہو اسی پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کا عہد تمھارے نبیوں سے لیا گیا تھا. یہ نبی اِسی عہد کے مطابق اُن پیش گوئیوں کا مصداق بن کر آیا ہے جو تمھاری کتابوں میں موجود ہیں. لیکن تم فسق کی راہ اختیار کرتے ہوئے اس عہد سے پھر گئے اور اِس رسول ﷺ کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچان لینے کے باوجود تکذیب و تحقیر پر کمر بستہ رہے. سو یہ عہد اسی لئے لیا گیا تھا تا خدا سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے اور کافروں کیلئے اُس دن عذاب ہے. یہ نظم کلام کی رعایت سے اس آیت کی تشریح ہے.

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں. ایک، یہی عہد آنحضرت ﷺ سے بھی لیا گیا ہے. اس سے مؤمنین کیلئے یاد دہانی ہے کہ وہ بھی آئندہ انبیاء کے متعلق انہی کافروں جیسا رویہ اختیار نہ کریں. لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید نے خود تخصیص کر دی ہے کہ اب آنحضرت ﷺ کے متبعین میں سے ہی نبی آ سکتا ہے آپ ﷺ کی شریعت کی پیروی کرتے ہوئے، جیسا کہ پیچھے ثابت کیا گیا ہے.

دوسرا، یہاں جلیل القدر انبیاء کے تذکرے سے مخاطبین پر اتمام حجت ہو جاتا ہے. کیونکہ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصارٰی بالترتیب موسی و عیسٰی علیہم السلام کی. یعنی جن انبیاء کی اتباع کا تمھیں دعوٰی ہے وہ سب اس نبی ﷺ پر ایمان کے عہد میں شامل ہیں.

4- نبوت: اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ

تسلسل نبوت کی آخری آیت کے طور پر عرفان شہزاد صاحب نے سورۃ حج کی آیت 76 پر بحث کی ہے.

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿الحج:76﴾

اللہ فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر چنتا ہے، جس طرح انسانوں میں سے چنتا ہے۔ بیشک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ (تدبر قرآن)

عرفان شہزاد صاحب لکھتے ہیں کہ یہ آیت اگلی آیات کی تمہید ہے جن میں بنی اسماعیل کو کارِ نبوت کی انجام دہی کیلئے چُنا گیا ہے. یہ بتایا جارہا ہے کہ جیسے پہلے افراد و اقوام کو چنا جاتا رہا ہے اسی سنت اللہ کے مطابق اب بنی اسماعیل کو چنا گیا ہے. یعنی خدا چنتا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ وہ چنتا رہے گا. کیونکہ اس نے سورۃ احزاب میں نبوت کے سلسلے کو ہی ختم کر دیا ہے.

ہمارا مدعا اس آیت اور اس طرز کی دوسری آیات سے یہ ہے کہ ان میں سنت اللہ کا بیان ہے. جس کا اعتراف عرفان شہزاد صاحب کو بھی ہے. سنت اللہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب آیت 63 میں فرمایا ہے کہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا "اور تم اللہ کی سنت میں ہر گز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے." لہٰذا تسلسل نبوت کی آیات بینات اور اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں ہم یہ موقف رکھتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ کا بیان ہے جو صیغہ مضارع سے بھی واضح ہے. (فعل مضارع کے تحت آیت میں دونوں معانی آجاتے ہیں یعنی چنتا ہے / چنے گا) لیکن اس کے باوجود فاضل ناقد اِس سنت اللہ میں استمرار سے انکاری ہیں. اور اس کا واحد سبب آیت خاتم النبیین کی انکی تشریح ہے جسے وہ اپنے آرٹیکل میں شروع سے آخر تک مسلسل ساتھ لے کر چلتے ہیں. ان کے اس رویے کی غلطی ہم

پیچھے واضح کر آئے ہیں. خیر، ہم اِس سنت جاریہ کی مزید آیات پیش کر کے بات ختم کرتے ہیں. ترجمہ امین احسن اصلاحی صاحب کا ہے لیکن ساتھ ہی استمراری معنی بھی لکھ دئے گئے ہیں.

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿آل عمران:190﴾

اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ تمہیں سارے غیب سے باخبر کر دے. بلکہ اللہ اس کام کیلئے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے / چاہے گا، منتخب کرتا ہے / کرے گا تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہے.

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ﴿نحل:3﴾

وہ فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اتارتا ہے / اتارے گا اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے / چاہے گا کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو مجھ ہی سے ڈرو۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿مومن:16﴾

وہ بلند درجوں والا اور عرش کا مالک ہے۔ وہ ڈالتا ہے / ڈالے گا روح– جو اس کے امر میں سے ہے– اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے / چاہے گا تا کہ وہ لوگوں کو روزِ ملاقات سے آگاہ کر دے۔

ان آیات مبارکہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبوت جاری ہے اگرچہ قرآن نے خود اس کی تخصیص کر دی ہے کہ اب نبی صرف آنحضرت ﷺ کے متبعین میں سے یعنی آپ ﷺ کی شریعت کے تحت ہی آسکتا ہے. جیسا کہ پیچھے

واضح کیا گیا ہے. لیکن جو لوگ اِس سنت اللہ کے کلیتاً انقطاع کے قائل ہیں وہ دراصل سنت اللہ میں تبدیلی کے قائل ہیں اور اس طرح خلاف قرآن عقیدہ رکھتے ہیں.

تسلسل نبوت کے باب میں اگرچہ اور آیات بھی موجود ہیں لیکن ہم یہاں اس کا اختتام کرتے ہیں. اس باب کی تمام آیات جو اس قسط اور اس سے پچھلی قسطوں میں پیش کی گئی ہیں، انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر واضح الفاظ میں جگہ جگہ نبوت جاری ہونے کا بیان قرآن مجید میں آیا ہے. اور ہر وہ شخص جو پہلے سے قائم کردہ عقائد کو قرآن مجید پر لاگو کرنے کی بجائے درست عقائد کیلئے اِس سے ہدایت کا خواستگار ہوتا ہے وہ ضرور اسی نتیجے پر پہنچتا ہے جو ہم نے اخذ کیا ہے. کتنے ہی جلیل القدر علماء یہی عقیدہ رکھتے تھے جو ہمارا ہے. کتنی ہی آیات ہیں جو ہمارے موقف کی تائید میں موجود ہیں جبکہ ہمارے مخالفین کے پاس صرف ایک آیت ہے اور اس کی جو تشریح وہ پیش کرتے ہیں وہ بھی نسبتاً جدید تشریح ہے. جیسا کہ آئندہ ہم انشاء اللہ واضح کریں گے.

باب سوم: جھوٹا مدعی نبوت اور اس کا انجام

عرفان شہزاد صاحب فرماتے ہیں کہ سورۃ الحاقۃ کی آیات 48-45 کا مدعا یہ ہے کہ اگر سچا نبی یعنی خود آنحضرت ﷺ بھی خدا کی طرف نعوذ باللہ جھوٹ منسوب کرتے تو خدا کی پکڑ میں آتے. لیکن اگر کوئی جھوٹا نبی یہ دعویٰ کرے کہ اسے الہام ہوتا ہے تو وہ ہلاک نہیں ہوتا. اس سے پہلے کہ ہم اس حوالے سے آیات قرآنی کی طرف بڑھیں، نظم کلام اور آیات کے پس منظر کے حوالے سے امین احسن اصلاحی صاحب کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"... صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ خود قرآن کے اشارات سے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب آپ یہ جان لیں گے کہ کلام کن لوگوں کو خطاب کر رہا ہے؛ جن لوگوں کو خطاب کر رہا ہے، اُن میں سے کن کی طرف اُس کا خطاب براہ راست اور کن کی طرف بالواسطہ ہے؛ کون سا مرحلہ ہے جس کے حالات سے مخاطب دوچار ہے اور اِس مرحلے نے کیا کیا سوالات اٹھا دیے ہیں جن کے جوابات کے دوست بھی منتظر ہیں اور دشمن بھی؛ نیز دشمنوں کی مخالفت کیا نوعیت اختیار کر چکی ہے اور دوست کس حال میں ہیں؛ مخالف صفوں میں کون کون سی پارٹیاں کن حربوں سے مسلح ہو کر آ شامل ہوئی ہیں اور موافقین کے مختلف گروہ کس طرز پر سوچ رہے ہیں تو خود بخود کلام کا سارا نظام آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائے گا۔" (مبادی تدبر قرآن ۲۱۰)

انہی اصولوں کی روشنی میں ہم سب سے پہلے سورۃ الحاقۃ کی درج ذیل آیات کا درست مدعا متعین کریں گے. اس کے بعد اس پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دیں گے.

اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۚ ۝ وَّ مَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۙ ۝ وَ لَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ‌ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ؕ ۝ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَ لَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ

الۡاَقَاوِیۡلِ ۙ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡیَمِیۡنِ ۙ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِیۡنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡهُ حٰجِزِیۡنَ ﴿الحاقة:48-41﴾

کہ بیشک یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے. اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں. تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو. اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں. تم بہت ہی کم سمجھتے ہو! یہ خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے. اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو قوی بازو سے پکڑتے. پھر ہم اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیتے. پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ بن سکتا. (تدبر قرآن)

پہلا اصول پس منظر کو دیکھتے ہوئے مخاطبین متعین کرنا بیان کیا گیا ہے: یہ سورۃ مبارکہ مکی ہے جیسا کہ اس کے مضمون سے بھی ظاہر ہے. سورۃ مبارکہ کی ابتدا سے ہی خطاب کفار مکہ کی طرف ہے جیسا کہ ان الفاظ سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو... تم بہت ہی کم سمجھتے ہو!"

دوسرا اصول مخاطبین کے حالات کے پیش نظر اٹھائے گئے سوالات طے کرنا ہے: فرمایا کہ قرآن مجید رسولِ کریم کا لایا ہوا ہے. یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں بلکہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے. ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مکہ کی طرف سے سوال / اعتراض یہ اٹھایا گیا تھا کہ نعوذ باللہ محمد ﷺ پر کوئی وحی نہیں ہوتی بلکہ یہ شاعروں اور کاہنوں جیسی باتیں بناتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں. یہ واحد اعتراض ہے جو ان آیات سے اخذ ہوتا ہے اور اسی کا جواب یہاں دیا گیا ہے. لیکن فاضل ناقد فرماتے ہیں کہ یہاں دو باتوں پر دلائل دیئے گئے ہیں ایک آنحضرت ﷺ کی صداقت پر اور دوسرا دین کی باحفاظت منتقلی پر. یہ دوسری بات کن الفاظ سے اخذ کی گئی ہے؟ اس کا کوئی حوالہ ان کی طرف سے نہیں دیا گیا.

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس اعتراض کا کیا جواب دیا ہے. فرمایا یہ رسول کریم کا لایا ہوا کلام ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی ہے.

اس کے وحی الہی ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ تم بہت کم ایمان لاتے ہو اور بہت کم غور و فکر کرتے ہو. کیونکہ اگر تم تعصب سے پاک ہو کر تدبر کرتے تو جان لیتے کہ یہ کلام شاعری یا کہانت کی صنف سے ہو ہی نہیں سکتا بلکہ یہ تو رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے. تم میں شاعر و کاہن موجود ہیں اور ان کا کلام بھی. اگر تمھارا اعتراض درست ہے تو کیوں کوئی شاعر اس جیسا کلام لکھنے کیلئے مقابل میں نہیں آتا. ظاہر ہے ایسے اعتراض تعصب اور قلت تدبر کا نتیجہ ہیں. یہ ہوئی پہلی دلیل.

دوسری دلیل یہ دی ہے کہ اگر نعوذ باللہ محمد ﷺ خود ساختہ باتیں خدا کی طرف منسوب کرتے تو خدائی پکڑ میں آتے اور کوئی بھی انھیں اس سے بچا نہ سکتا. یعنی قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اس کا حامل خدائی تائیدات رکھتا ہے جبکہ جھوٹا تو خدا کی گرفت میں آتا ہے. دیکھیں کیسی مضبوط دلیل قرآن مجید پیش کرتا ہے. آنحضرت ﷺ ایک اکیلے شخص تھے اور پورا سماج آپ کے مقابل. ہر آن محمد رسول اللہ ﷺ کی ہی تائید ہوتی رہی اور اللہ تعالیٰ نہیں رکا جب تک فتح مبین رسول اللہ کو حاصل نہ ہوئی. اور یہ سب منکرین کے سامنے ہوا.

امین احسن اصلاحی صاحب کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں ان آیات کی یہ تشریح بنتی ہے جو کہ درست تشریح ہے.

اب ہم عرفان شہزاد صاحب کے استدلال کا تجزیہ کرتے ہیں. وہ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اگر سچا نبی خدا کی طرف جھوٹ منسوب کرے تو وہ خدائی گرفت میں آتا ہے لیکن جھوٹا نبی اس پکڑ سے آزاد ہے.

یہ بات سمجھ لیجئے کہ ان تمام آیات میں خطاب کفار مکہ کی طرف ہے. ان سے بلکہ کسی سے بھی یہ بات کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا کفار مکہ کا جواب اس سے مختلف ہو گا کہ (نعوذ باللہ) جبھی تو تمھارا نبی ہلاک نہیں ہوا، اس میں اس کی صداقت کی کون سی دلیل ہے؟ اس استدلال سے گویا یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ہر ایک مدعی نبوت جو ہلاک ہو گیا نعوذ باللہ امکان ہے کہ وہ مدعی سچا تھا لیکن خدا تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کر بیٹھا، اس لئے ہلاک کیا گیا. اور تمام مدعی نبوت جن کی جماعتیں بڑھیں اور سینکڑوں پیش گوئیاں ان کی پوری ہوئیں، انھیں جھوٹا ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مہلت دی تھی! سو افسوس ہے ان لوگوں پر جو ایسی باتیں کر کے مخالفین کو اسلام پر ہنسی کا موقع دیتے ہیں.

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دین کے ابلاغ میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی.

مکرر عرض ہے کہ ان آیات میں خطاب رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے ہی نہیں بلکہ کفار مکہ مخاطب ہیں. ان کیلئے ایسی بات کرنے سے کیا حاصل؟ پھر آیات کا یہ مقصد سیاق وسباق سے بھی میل نہیں کھاتا جیسا کہ تفصیلاً بیان کیا گیا ہے.

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ اگر ان آیات سے سچے نبی کا عمومی معیار بتانا مقصود ہوتا تو طرز بیان آنحضرت ﷺ کیلئے مخصوص نہ ہوتا. ان کی اس بات پر حیرت ہوتی ہے. ایک تو یہ بات ان کی پچھلی بات سے متضاد ہے. ابھی انھوں نے فرمایا تھا کہ اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ سچا نبی افترا کرے تو ہلاک ہوتا ہے جبکہ جھوٹا ایسا کرے تو ہلاک نہیں کیا جاتا. یہ اصول تب اخذ ہو گا جب اس آیت کی عمومی حیثیت کا اعتراف کیا جائے گا. اگر یہ آیت آنحضرت ﷺ کیلئے مخصوص ہے تو یہ عمومی نتیجہ آپ نے کیسے نکالا؟ یقیناً اس آیت کی عمومی حیثیت کو مان کر ہی یہ نتیجہ نکالا. اب اگر آپ عمومی حیثیت مانتے ہیں تو یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا جو آپ نے ابھی کیا ہے اور اگر

عمومی حیثیت نہیں مانتے تو وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو آپ بیان فرماتے ہیں. بلکہ تب تو ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ آیت مبارکہ آنحضرت ﷺ کیلئے مخصوص ہے اس لئے اگر آپ ﷺ نعوذ باللہ خدا کی طرف جھوٹ منسوب کرتے تو ہلاک ہوتے. لیکن ان کے علاوہ کوئی جھوٹ منسوب کرے تو وہ ہلاک نہیں ہوتا خواہ سچا ہو یا جھوٹا.

قطع نظر اس تضاد بیانی کے، کیا قرآن مجید میں یہ عام اسلوب نہیں پایا جاتا کہ آنحضرت ﷺ کے حوالے سے کی جانے والی بات اپنے اندر عمومی رنگ رکھتی ہے؟ مثلاً سورۃ غاشیہ میں فرمایا:

فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿الغاشية:22-23﴾

تم یاد دہانی کرو! تم بس ایک یاد دہانی کر دینے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر ہو۔

ان آیات میں اگرچہ خطاب آنحضرت ﷺ کی طرف ہے لیکن دراصل اس میں ہر نبی بلکہ ہر مبلغ کا ذکر ہے. یہ بھی درست ہے کہ ہر جگہ یہ اصول لاگو نہیں ہوتا لیکن زیرِ بحث آیات میں بہر حال یہ بات بتمام و کمال عائد ہوتی ہے.

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ دین کی باحفاظت منتقلی کے بعد اب اس کی حفاظت کیلئے ایسے انتظام کی ضرورت نہیں کہ جھوٹا نبی ہلاک کیا جائے.

نجانے یہ بات کہاں سے اخذ کی گئی ہے کہ ان آیات میں دین کی حفاظت زیرِ بحث ہے. اگر اس آیت کا سیاق و سباق دیکھئے تو بالکل متعین ہو جاتا ہے کہ بحث اس بات پر ہے کہ آیا قرآن مجید اللہ کا کلام ہے یا خود ساختہ شاعری وغیرہ. اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے.

اور نہ صرف قرآن میں جھوٹے نبی کی یہ نشانی بیان ہوئی ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آتا ہے بلکہ سابقہ الٰہی کتب میں بھی کسی نبی کی صداقت کی یہی علامت لکھی ہے. چنانچہ تورات میں ذکر ہے:

But the prophet, which shall presume to speak a word in my name, which I have not commanded him to speak, or that shall speak in the name of other gods, even that prophet shall die. (Deuteronomy 18:20 KJV)

لیکن جو نبی میرے نام سے کلام کرنے کی جرات کرے جبکہ میں نے اسے ایسا کچھ کہنے کا حکم نہیں دیا، یا دوسرے معبودوں کے نام سے کلام کرے تو ضرور ہے کہ وہ نبی ہلاک ہو۔ (اِسْتِثنا 18:20)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد جب حواریوں نے یروشلم میں تبلیغ شروع کی تو مجرم کے طور پر یہودی شرعی عدالت میں لائے گئے، کاہنوں نے چاہا کہ انھیں کسی طرح رستے سے ہٹا دیں لیکن ایک عالم دین نے انھیں یہ نصیحت کی:

وہ یہ سُن کر جل گئے اور اُنہیں قتل کرنا چاہا۔ مگر گملی ایل نام ایک فرِیسی نے جو شرع کا مُعلِّم اور سب لوگوں میں عِزّت دار تھا عدالت میں کھڑے ہو کر حُکم دِیا کہ اِن آدمیوں کو تھوڑی دیر کے لِئے باہر کر دو۔ پِھر اُن سے کہا کہ اَے اِسرائیلیو! اِن آدمیوں کے ساتھ جو کُچھ کِیا چاہتے ہو ہوشیاری سے کرنا۔ کیونکہ اِن دِنوں سے پہلے تھِیُوداس نے اُٹھ کر دعویٰ کِیا تھا کہ مَیں بھی کُچھ ہُوں اور تخمِیناً چار سَو آدمی اُس کے ساتھ ہو گئے تھے مگر وہ مارا گیا اور جِتنے اُس کے ماننے والے تھے سب پراگندہ ہُوئے اور مِٹ گئے۔ اِس شخص کے بعد یہُوداہ گلِیلی اِسم نوِیسی کے دِنوں میں اُٹھا اور اُس نے کُچھ لوگ اپنی طرف کر لِئے۔ وہ بھی ہلاک ہُؤا اور جِتنے اُس کے ماننے والے تھے سب پراگندہ ہو گئے۔ پس اب مَیں تُم سے کہتا ہُوں کہ اِن آدمیوں سے کنارہ کرو اور اِن سے کُچھ کام نہ رکھّو۔ کہِیں اَیسا نہ ہو کہ خُدا سے بھی لڑنے والے ٹھہرو کیونکہ یہ تدبِیر یا کام اگر آدمیوں کی طرف سے ہے تو آپ برباد ہو جائے گا۔ لیکن اگر خُدا کی طرف سے ہے تو تُم اِن لوگوں کو مغلُوب نہ کر سکوگے۔ (اَعمال 5:33-39)

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سمیت کسی الہامی کتاب میں "کامیاب جھوٹے نبی" جیسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا. پس دیگر دلائل کے ساتھ یہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی ایک قوی دلیل ہے.

باب چہارم: ایک مصلح کی نوید

1- قرآن وحدیث میں امام مہدی کی پیش گوئی:

پچھلے ابواب میں عمومی طور پر تسلسل نبوت کی آیات پر بحث کی گئی تھی. اب ایک مصلح کی آمد پر مشتمل آیات پیش کی جاتی ہیں. اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت سورۃ جمعہ کی آیت 4 ہے جس میں خود آنحضرت ﷺ کی بعثت ثانیہ کی پیش گوئی کی گئی ہے. چنانچہ فرمایا:

ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿الجمعة:3﴾

اسی نے اٹھایاہے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ (تدبر قرآن)

اگلی آیت میں فرمایا:

وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿الجمعة:4﴾

اور اِنہی میں سے اُن دوسروں میں بھی جو ابھی اِن میں شامل نہیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ (تدبر قرآن)

یعنی: "آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کیا ہے جو اُمیوں میں سے ہیں لیکن ابھی اُمیوں میں شامل نہیں ہوئے." (منھم اور بھم دونوں میں ضمیر اُمِّیّٖنَ کی طرف ہے)

امین احسن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

"اوپر (آیت 3 میں) اگرچہ لفظ 'اُمِّیّٖنَ' عام استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد صرف وہ بنی اسمٰعیل ہیں جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چنانچہ آیت کا ٹکڑا 'وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ' اس پر دلیل بھی ہے۔" (تدبر قرآن)

اب آیت مبارکہ کی تشریح یہ ہوگی:

"آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کیا ہے جو صحابہ میں سے ہیں لیکن ابھی صحابہ میں شامل نہیں ہوئے. "

بعد میں آنے والے اِن لوگوں کو صحابہ میں شامل کیا گیا ہے اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ وعطف سے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت ﷺ ان صحابہ پر بھی خدا کی آیات تلاوت کریں گے، انہیں بھی پاک کریں گے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیں گے اور وہ لوگ بھی اس سے پہلے گمراہی میں پڑے ہوں گے.

چنانچہ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب امت تزکیہ نفس سے محروم اور کتاب و حکمت کی تعلیم بھلا دے گی اور دوبارہ کھلی کھلی گمراہی میں پڑ جائے گی تو خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو دوبارہ مبعوث فرمائے گا اور ایک ایسی جماعت تیار ہوگی جو صحابہ کے نمونے دکھائے گی. اب ظاہر ہے کہ خود رسالت مآب ﷺ کا دوبارہ دنیا میں آنا تو محال ہے لہٰذا اس سے آپ ﷺ کے بروز یعنی کامل متبع کا آنا ہی مراد ہو سکتا ہے جسے بوجہ کامل مشابہت مجازی طور پر آپ ﷺ کا نام دیا گیا ہے. چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ نے اِس آیت مبارکہ کی یہی تشریح فرمائی ہے:

بخاری میں آتا ہے کہ جب سورۃ جمعہ کی یہ آیات نازل ہوئیں تو کسی صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ آخرین (دوسرے جن میں آنحضرت ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے) کون ہیں؟ آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رَجُلٌ مِنْ هَؤُلَاءِ

یعنی کسی زمانے میں اگر ایمان دنیا سے غائب ہو کر ثریا ستارے پر بھی چلا گیا تب بھی ان فارسی لوگوں میں سے ایک شخص اسے دوبارہ زمین پر اتار لائے گا. (بخاری، 4897)

احادیث میں مہدی و مسیح کی یہی علامات بیان ہوئی ہیں. اس آنے والے کو کوئی بھی نام دیجئے، بہر حال ایک مصلح کے آنے کی پیش گوئی ان آیات میں موجود ہے.

اب اہل المورد کے موقف کا جائزہ لیتے ہیں. امین احسن اصلاحی صاحب اُمِّيّنَ سے درست طور پر صحابہ مراد لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود آیت مبارکہ کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کو دوسروں میں بھی مبعوث کیا ہے جو عربوں (اُمِّيّنَ) میں سے ہیں لیکن ابھی صحابہ (اُمِّيّنَ) میں شامل نہیں ہوئے.

یعنی اس آیت میں "دوسروں" سے مراد وہ عرب ہیں جو ابھی ایمان لا کر صحابہ میں شامل نہیں ہوئے تھے.

اس پر عرض ہے کہ جب اُمِّيّنَ سے صرف صحابہ مراد ہیں تو اپنے موقف کی تائید کیلئے ایک ہی آیت میں ایک مرتبہ اس سے غیر صحابہ مراد لینا اور دوسری مرتبہ صحابہ مراد لینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ یا تو دونوں دفعہ عرب مراد ہوں گے یا دونوں مرتبہ صحابہ. یہ سقم ہے جو اصلاحی و غامدی صاحب کی تفاسیر میں پایا جاتا ہے.

اس لئے ایک ہی مفہوم اس آیت سے اخذ ہوتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے.

2- پیش گوئی : آنحضرت ﷺ کا ایک گواہ آئیگا

اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ وَ یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُہٗ ۚ فَلَا تَکُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡہُ ٭ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿ہود:18﴾

(ترجمہ وتفسیر از تفسیرِ کبیر، حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ)

"پس کیا جو (شخص) اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر (قائم) ہے اور (اس کی صداقت کا) ایک گواہ اُس (یعنی خدا تعالی) کی طرف سے (آکر) اس کی پیروی کرے گا اور اس سے پہلے موسی کی کتاب تھی جو (لوگوں کیلئے) امام اور رحمت تھی (ایک جھوٹے مدعی جیسا ہو سکتا ہے؟) وہ (یعنی موسی کے سچے پیرو) اس پر (بھی ضرور) ایمان لاتے ہیں اور ان (مخالف) گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے گا تو (دوزخ کی) آگ اس کے (لئے) وعدے کی جگہ ہے. پس (اے مخاطب) تو اس کے متعلق کسی (قسم کے) شک میں نہ پڑ. وہ یقیناً بالکل حق ہے. (اور) تیرے رب کی طرف سے ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لایا کرتے."

"قرآن شریف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر کھنے کے لئے تین گُر بتائے گئے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا...

دنیا میں اس سچائی سے تعلق رکھنے والے تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔

(ا) ایک وہ جو اس وقت اس کے مخاطب ہوں۔

(۲) وہ جو اس وقت تو مخاطب نہ ہوں لیکن آئندہ مخاطب بننے والے ہوں۔

(۳) تیسرے وہ لوگ جو پچھلے زمانہ میں گذر چکے ہوں۔ لیکن وہ اس آنے والے تغیر کی امید رکھتے تھے.

اگر ان تینوں قسم کے گواہوں سے کسی امر کی سچائی ثابت ہو تو اس سچائی میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تینوں کے تینوں زمانے اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں۔

جو لوگ کسی صداقت کے منتظر ہوں لیکن ابھی وہ صداقت ظاہر نہ ہوئی ہو ان کے ایمان کی بنیاد خالص طور پر امور غیبیہ پر ہوتی ہے۔ اور جن لوگوں کے سامنے وہ صداقت آگئی ہو وہ اس کو دو پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔

(۱) کیا اس کی ذات میں کوئی ایسا ثبوت موجود ہے جس سے اس کا سچائی ہونا ثابت ہوتا ہو۔

(۲) اس سچائی کے متعلق جو پہلی کتب میں خبریں تھیں کیا وہ اس کے ذریعہ سے پوری ہو جاتی ہیں۔

جب یہ زمانہ بھی گزر جاتا ہے اور ایسے لوگ دنیا میں پیدا ہوتے ہیں جن کے لئے یہ سب باتیں قصہ ہو جاتی ہیں تو ان کے لئے ایک تیسری شہادت پیدا کی جاتی ہے اور وہ اس صداقت کے ثمرات ہیں۔ وہ لوگ علاوہ پہلی دونوں قسم کی دلائل کے اس امر پر بھی غور کر سکتے ہیں کہ اس صداقت کے ثمرات کیا پیدا ہوئے اور اگر اس کے ثمرات ان کے زمانہ تک پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ صداقت ان کے زمانہ سے بھی ویسا ہی تعلق رکھتی ہے جیسا کہ پہلے زمانوں سے...

قرآن کریم کی تائید میں ان تینوں قسم کے دلائل کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں بھی صداقت کے ثبوت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کی کتب میں بھی اس کی تصدیق موجود ہے اور بعد میں بھی اس کے ثمرات ایسے طور پر ظاہر ہوتے رہیں گے کہ لوگوں کو اس کے انکار کی گنجائش نہ ہو سکے گی۔

چنانچہ سب سے پہلے فرماتا ہے کہ قرآن کریم یا اس کالانے والا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے ساتھ ایسے دلائل رکھتا ہے جو قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور چونکہ قرآن کریم کا زمانہ ممتد ہونے والا تھا اور اس نے بعید ترین زمانہ کے لوگوں کو بھی ہدایت دینی تھی اس لئے فرمایا کہ ویتلوہ شاہد منہ. اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے جب اتنا عرصہ گذر جائے گا کہ پہلے دلائل قصوں کے رنگ میں رہ جائیں گے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نیا گواہ آجائے گا۔ پھر فرمایا کہ علاوہ ان موجودہ دلائل کے گذشتہ نبیوں نے بھی اس کی خبر دی ہوئی ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے کہ وہ امام ہے یعنی لوگوں کو کھینچ کھینچ کر ادھر لاتی ہے اور رحمت ہے کہ قرآن کے ماننے کے لئے اس نے لوگوں کے واسطے آسانیاں کر دی ہیں اولئک یؤمنون بہ یعنی جن لوگوں کے لئے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت بن جاتی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں...

شاہد منہ کے متعلق مفسرین نے اختلاف کیا ہے... بعض نے شاہد منہ کے معنی ابو بکر کے اور بعض نے حضرت علی کے کئے ہیں مگر یہ بھی درست نہیں کیونکہ آیت میں شاھد کے لئے منہ کی شرط لگائی گئی ہے۔ یعنی وہ شاہد خدا تعالیٰ کی طرف سے اس شہادت کے لئے حکم پاکر کھڑا ہو گا۔ اور حضرت ابو بکر اور حضرت علی کی طرف سے ہرگز یہ دعویٰ نہ تھا کہ ان کو خدا تعالیٰ نے شہادت کے لئے مبعوث کیا ہے۔ بعض لوگوں نے عبد اللہ بن سلام کو شاہد قرار دیا ہے۔ لیکن ان پر بھی یہی اعتراض پڑتا ہے۔

پس جاننا چاہئے کہ اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی ذکر ہے جن کا نزول خدا تعالیٰ کی طرف سے اسی رنگ میں ہونا تھا جیسے کہ پہلے بینہ کا نزول ہوا تھا۔ اور جن کی آمد کی غرض یہ تھی کہ وہ اسلام کی صداقت کی شہادت تازہ نشانوں سے دیں جبکہ اسلام کی صداقت اور اس کی قوت قدسیہ کے خلاف بہت سے امور جمع ہونے والے تھے..."

اہل المورد کے ہاں اس آیت کی یہ تفسیر کی جاتی ہے:

سو کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک برہان پر ہے، پھر (اُس کی تائید میں) اُس کے بعد ایک گواہ بھی اُس کے پروردگار کی طرف سے آجاتا ہے اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی موجود ہے، (اِس قرآن کا انکار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں)۔ اِس طرح کے لوگ تو اِس پر ایمان ہی لائیں گے۔ اور (تمھارے مخاطبین کے) اِن گروہوں میں جو شخص بھی اِس کا منکر ہو گا، اُس کے لیے وعدے کی جگہ دوزخ ہے۔ اِس لیے، (اے پیغمبر) تم اِس کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہ حق ہے تمھارے پروردگار کی طرف سے، مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ (البیان)

یعنی قرآن مجید کو وہ شخص قبول کرتا ہے جو اپنے پروردگار کی طرف سے برہان یعنی حق و باطل میں تمیز کا نور رکھتا ہو. پھر اس نورِ فطرت کی تائید میں ایک گواہ یعنی وحی الہی بھی آجاتی ہے. پھر کتابِ موسی بھی ایسی وحی کی تائید میں پہلے سے موجود ہے. اس کے مقابل وہ جن کا نورِ فطرت بجھ جاتا ہے ایسے دنیا پرست ہی قرآن مجید کو قبول نہیں کرتے.

یہ تفسیر سیاق و سباق سے مطابقت نہیں رکھتی جو ہم واضح کئے دیتے ہیں.

یہ سورۃ ہود کی آیت 18 ہے. اس سے پہلے آیت 14 میں کفار مکہ کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ محمد ﷺ نے خدا پر افترا کیا ہے. اس کے جواب میں درج ذیل دلائل دئے ہیں:

(ا) فرمایا کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں گھڑ لاؤ اور اپنے مددگار بھی بلالو. اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کیا پھر صداقت کو قبول کر لو گے؟ اصل میں تو تم دنیا پرست ہو سو خدا پرستی تمھارے لئے مشکل ہے.

(۲) فرمایا جسے تم مفتری کہتے ہو وہ تو تینوں زمانوں میں اپنی صداقت پر دلائل رکھتا ہے. اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے.

آیت 14 میں افترا کے اعتراض پر جو بات شروع ہوئی تھی اسے سمیٹتے ہوئے آیت 19 میں فرمایا کہ مفتری تو ظالم ہوتا ہے اور اس پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے. یعنی صادقوں کی حالتیں اور ہوتی ہیں اور کاذبوں کی اور. سو غور کرو کیسے اعتراض کر رہے ہو!

آیت 14 اور 19 کے اس ربط کو ملحوظ رکھئے تو بالکل طے ہو جاتا ہے کہ ان آیات میں افترا کے اعتراض پر آنحضرت ﷺ کی صداقت کے دلائل دئے گئے ہیں. اس سیاق وسباق میں محذوف یہ بنتا ہے کہ کیا وہ شخص مفتری ہو سکتا ہے جو ایسے دلائل رکھتا ہے، نہ کہ وہ محذوف جو غامدی صاحب نے بیان کیا ہے (یعنی: کیا وہ شخص قرآن کا انکار کر سکتا ہے جو ایسے دلائل رکھتا ہے). پھر آیت کے الفاظ پر بھی غور کیجئے، اگر یہاں آنحضرت ﷺ کی صداقت زیر بحث نہ ہوتی تو خصوصاً کتاب موسی کا ذکر کیوں کیا جاتا؟ کتاب موسی حضور ﷺ کی گواہی دیتی ہے اور ان پر ایمان لانے کیلئے لوگوں کی رہنمائی کرنے والی کتاب ہے. غرض، ان آیات میں آنحضرت ﷺ کے گواہ کا آنا مذکور ہے، خود آپ ﷺ یا آپکی وحی کو گواہ نہیں ٹھہرایا گیا ہے.

لیکن چونکہ اصلاحی وغامدی صاحب نے آیات کے اس ربط کو نہیں سمجھا، اس لئے آیتِ مذکورہ کا پچھلی آیات سے ایک مصنوعی ربط قائم کیا ہے اور وسیع تر نظم کلام کو نظر انداز کیا ہے. نیز، محذوف متعین کرنے میں بھی غلطی کھائی ہے.

3- مسیح موعود کے زمانے کی علامات (حصہ اول):

اب ہم ان آیات کا ذکر کریں گے جن میں مسیح موعود کے زمانے کی علامات بیان ہوئی ہیں اور ان کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے. تفصیلات میں جانے سے قبل چار باتیں اصولی طور پر سمجھ لیجیے:

(ا) بعض مقامات پر ان پیش گوئیوں کے ساتھ قیامت کا بھی ذکر ہوتا ہے. کیونکہ عام محاورہ قرآن مجید کا ہے کہ دنیا کے ایک واقعے کے ساتھ آخرت کا واقعہ پیوند کیا جاتا ہے لیکن معمولی تدبر سے واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں.

نمونے کے طور ہم سورۃ قمر کے دو مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے یہ اصول قطعیت سے ثابت ہو جاتا ہے.

پہلے سورۃ قمر کی آیات 49-45 ملاحظہ فرمائیں. ان میں فرمایا ہے کہ کفار کی کثیر جماعت انھیں کچھ فائدہ نہ دے گی اور عنقریب یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے. اور پھر اس بیان کے ساتھ دوزخ کا ذکر بھی ملا دیا ہے.

دوم، سورۃ قمر کی ابتدائی آیات دیکھیں. فرمایا کہ قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا. قیامت کے ذکر سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ شق القمر کا معجزہ ظہور میں نہیں آیا بلکہ قیامت کو ہو گا. حالانکہ بعد کی آیات بالکل واضح کر دیتی ہے کہ یہ آیات شق القمر کے واقعے کے بعد نازل ہوئی ہیں کیونکہ فرمایا کہ جب کافر کوئی نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے. آگے فرمایا کہ انھوں نے پہلے لوگوں سے بھی سبق نہیں سیکھا بلکہ انہی کی طرح نشان دیکھنے کے بعد بھی انکار ہی کیا ہے. یہاں بھی دنیا کے واقعے کے ساتھ قیامت کا ذکر کیا گیا ہے.

(۲) اسی طرح بعض آیات میں صرف آخری زمانے کی علامات ہی مذکور ہوتی ہیں اور ان میں قیامت کا کوئی ذکر نہیں ہوتا. لیکن قلت تدبر کی وجہ سے انھیں قیامت پر محمول کر لیا جاتا ہے. مثلاً سورۃ تکویر جس کی تفصیل آگے بیان کی جاتی ہے.

(۳) جب یہ ثابت ہو جائے کہ ان آیات میں قیامت کی نہیں بلکہ مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی ہے تو ان میں تشبیہ اور استعارے کا موجود ہونا ایک بدیہی بات ہے. کیونکہ خود غامدی صاحب کو اعتراف ہے کہ اگر کوئی شخص مستقبل کی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی خبر دے تو تشبیہات اور استعاروں میں ہی کلام کرے گا. وہ فرماتے ہیں:

"آج سے دو صدی پہلے ہم میں سے کوئی شخص اگر مستقبل کا علم پا کر بجلی کے قمقموں کا ذکر کرتا تو غالباً اِسی طرح کرتا کہ دنیا میں ایسے چراغ جلیں گے جن میں نہ تیل ڈالا جائے گا اور نہ اُنھیں آگ دکھانے کی ضرورت ہو گی."

(میزان، صفحہ 34)

(۴) بہت سی پیش گوئیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک ان کا مصداق ظہور میں نہ آئے، کوئی حتمی بات ان کے متعلق کہی نہیں جا سکتی. لیکن جب وہ ظاہر ہو جاتا ہے تو کوئی اور تفسیر ممکن نہیں رہتی. مثلاً وہ سب آیات جن میں سائنسی ایجادات اور دریافتوں کا بیان ہونا ذکر کیا جاتا ہے، ان کا اصل مصداق ان دریافتوں کے بعد ہی معلوم ہوا ہے.

غامدی صاحب آنحضرت ﷺ کی ایک پیش گوئی کی وضاحت اس طرح سے کرتے ہیں:

"ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جن دے گی اور دوسری یہ ہے کہ تم (عرب کے) اِن ننگے پاؤں، ننگے بدن پھرنے والے کنگال چرواہوں کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے دیکھو گے۔" (صحیح مسلم، 93)

اِن میں سے دوسری علامت تو بالکل واضح ہے۔ پچھلی صدی سے اِس کا ظہور سر زمین عرب میں ہر شخص بہ چشم سر دیکھ سکتا ہے۔ پہلی علامت کا مصداق متعین کرنے میں لوگوں کو دقت ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک اُس کا مفہوم بھی بالکل واضح ہے۔ اُس سے مراد ایک ادارے کی حیثیت سے غلامی کا خاتمہ ہے۔ یہ دونوں واقعات ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ پیشین گوئی قرب قیامت کا زمانہ بالکل متعین کر دیتی ہے۔ (میزان، صفحہ 176)

کیا اس پیشگوئی کے پورا ہونے سے پہلے اس کے مصداق کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہا جا سکتا تھا؟ یقیناً نہیں. اس لئے پیش گوئیوں کے معاملے میں بہت احتیاط اور تقویٰ کی ضرورت ہوتی ہے. انبیاء کے مخالفین اسی راہ سے ٹھوکر کھاتے ہیں.

ان اصولوں کے بعد اب ہم مسیح موعود کے زمانے کی پیش گوئیوں کا ذکر کرتے ہیں. سب سے پہلے سورۃ تکویر کی پہلی پندرہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

"اللہ کے نام کے ساتھ جو بے انتہا رحم کرنے والا، بِن مانگے دینے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے. جب سورج لپیٹ دیا جائے گا. اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے. اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے. اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بغیر کسی نگرانی کے چھوڑ دی جائیں گی. اور جب وحشی اکٹھے کئے جائیں گے. اور جب سمندر پھاڑے جائیں گے. اور جب نفوس ملا دئے جائیں گے. اور جب زندہ در گور کی جانے والی (اپنے بارہ میں) پوچھی جائے گی. (کہ)

آخر کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی ہے؟اور جب صحیفے نشر کئے جائیں گے. اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ دی جائے گی. اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی. اور جب جنت قریب کر دی جائے گی. ہر جان معلوم کر لے گی جو وہ لائی ہے."

اہل المورد کے ہاں ان آیات کو قیامت پر محمول کیا جاتا ہے. کہ جب قیامت برپا ہو گی تو اجرام فلکی اپنی روشنی کھو دیں گے اور ایسا زلزلہ آئے گا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑتے پھریں گے. ایسی ہولناکی ہو گی کہ انسان کو حاملہ اونٹنی جیسی قیمتی چیز کا بھی ہوش نہ رہے گا. اس بھگدڑ میں وحشی جانور بھی جہاں جائے پناہ دیکھیں گے،اپنی درندگی بھلا کر اکٹھے ہو جائیں گے. سمندر بھی بے قابو ہو کر سونامی کا باعث ہوں گے. اس کے بعد میدان محشر کا منظر ہے کہ وہاں لوگوں کے ان کے اعمال کے مطابق گروہ بنا دئے جائیں گے اور ظالموں پر گرفت کیلئے زندہ در گور کی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ پر ماری گئی؟اور اعمال نامے کھول دئے جائیں گے اور جہنم کے بھڑکنے کی وجہ سے آسمان سرخ ہو جائے گا گویا اس کی کھال ادھیڑ دی گئی ہو. جنت بھی قریب کر دی جائے گی تب ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا اعمال آگے بھیجے تھے.

اس تفسیر میں بہت سے سقم ہیں. جب ایک طرف کسی قسم کی آسمانی روشنی باقی نہ رہے اور دوسری طرف زمین کا یہ حال ہو کہ شدید زلزلے کے باعث پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو رہے ہوں اور سونامی ہر طرف چھائی ہو،ایسے حالات میں تو تمام جاندار پل بھر میں ہلاک ہو جائیں گے قبل اس کے کہ وہ جانیں کہ ہو کیا رہا ہے. ایسے میں اونٹنیوں کا چُھوٹے پھرنا یا وحشی جانوروں کا جائے پناہ ڈھونڈتے پھرنا، ممکن ہی نہیں. آجکل ذرا سا زلزلہ آتا ہے اور ایک لمحے میں سب ملیامیٹ کر جاتا ہے. پھر یہاں تو ایسی شدت ہو گی کہ پہاڑ ٹوٹ گریں گے.

اور اگر ہم بالفرض مان بھی لیں کہ جانداروں کو کچھ وقت زندہ رہنے کا مل جائے گا تو بھی اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں دکھائی کسے دے گا کہ وہ جائے پناہ ڈھونڈے؟

ان کی تفسیر میں اس کے بعد کے واقعات کو میدان محشر کی طرف منسوب کیا گیا ہے. فرماتے ہیں کہ زندہ در گور کی جانے والی سے پوچھا جائے گا، حالانکہ قرآن مجید نے ایک سے زائد مقامات پر بالکل واضح فرمادیا ہے کہ اُس دن سوال صرف مجرم سے کیا جائے گا غیر مجرم سے نہیں. اگر کہو کہ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی توانھیں الہ بنالینے کے بابت سوال ہو گا. اس کا جواب یہ ہے کہ ان سے سوال تو نصاریٰ کے اس دعویٰ کی وجہ سے ہو گا کہ ہمیں خود مسیح نے اپنی الوہیت کی تعلیم دی ہے. لیکن یہاں تو ایسا کوئی معاملہ نہیں.

اس کے علاوہ اگلی آیت میں آسمان کا ذکر ہونا بھی واضح کر دیتا ہے کہ اِسی دنیا کی ہی بات کی جارہی ہے. اور اُسی بات کا تسلسل ہے جو شروع کی گئی تھی.

لہذا بالکل طے ہے کہ ان آیات میں قیامت کا ذکر ہی نہیں. پھر یہ کس زمانے کی پیش گوئی کی جارہی ہے؟

اب ہم ان آیات کی درست تفسیر پیش کرتے ہیں:

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، سیاق وسباق اجازت نہیں دیتا کہ اسے حقیقی معنوں میں لیا جائے جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں. بلکہ یہ وہی سورج ہے جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سورج مغرب سے طلوع ہو گا یعنی اسلام کا سورج. یہ وہ دور ہے جب اسلام یا خود آنحضرت ﷺ کی روشنی پر پردہ ڈال دیا جائے گا. ایک طرف خود اس کے نام لیوا اس نور کو دھندلائیں گے تو دوسری طرف مخالفین کی سرگرمیاں بھی عروج پر ہوں گی.

اور جب ستارے ماند پڑ جائیں گے یعنی علماء اسلام بھی اسلام کیلئے ننگ وعار ہوں گے، گویا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گا. مامور من اللہ ایسے دور میں ہی مبعوث ہوا کرتے ہیں.

اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، یہاں کسی زلزلے کا ذکر نہیں ہے. اس سے مراد بڑی بڑی سلطنتوں کا اُکھڑنا ہے کیونکہ جبل سردار کے معنوں میں بھی آتا ہے. یا اس سے مراد دیو ہیکل مشینوں کا ایجاد ہونا بھی ہو سکتا ہے. کیونکہ آگے جدید سواریوں کا ہی ذکر ہے. چنانچہ مسیح موعودؑ کے دور میں یورپی اقوام یعنی یاجوج ماجوج کے خروج کی وجہ سے بڑی بڑی سلطنتیں پامال ہوئیں.

اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بغیر کسی نگرانی کے چھوڑ دی جائیں گی یعنی جانوروں کی سواری ترک کر دی جائے گی. مسیح موعودؑ کے دور میں خصوصاً ریل اور دیگر آمد ورفت کی ایجادات سے یہ پیش گوئی پوری ہوئی.

اور جب صحیفے نشر کئے جائیں گے یعنی کثرت سے کتب ورسائل کی اشاعت کے سامان میسر ہوں گے. یہ واقعہ بھی مسیح موعودؑ کے دور کا ہے.

اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ دی جائے گی یعنی بری و بحری ہی نہیں بلکہ آسمانی رازوں سے بھی پردہ اٹھایا جائے گا. چنانچہ ہوائی جہاز بھی مسیح موعودؑ کے زمانے کی ایجاد ہے.

اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی. سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ یہاں بھی دنیا کا ہی ذکر ہونا چاہیے. چنانچہ ان ایجادات و آسائشوں کے بیان سے شاید کسی کے ذہن میں آئے کہ وہ دور تو جنت نظیر ہوگا. فرمایا کہ نہیں بلکہ انھیں ایجادات کے ذریعے عالمی جنگوں کی جہنم بھڑکا دی جائے گی. اور جہنم کی راہیں آسان ہو جائیں گی.

اور جب جنت قریب کر دی جائے گی یعنی صرف تباہی کے سامان نہیں ہوں گے بلکہ آسائشیں بھی عام ہوں گی اور خدا کے مامور کی موجودگی میں جنت کا حصول آسان ہو جائے گا.

ہر جان معلوم کر لے گی جو وہ لائی ہو گی یعنی اعمال کے نتائج وسیع پیمانے پر ظاہر ہوں گے. مسیح موعودؑ کے دور سے دنیا اس کا مشاہدہ کر رہی ہے.

اس کے بعد کی آیات میں کفر کی رات رخصت ہونے اور اسلام کی صبح طلوع ہونے کا واضح ذکر موجود ہے. جو مسیح موعودؑ کے ساتھ مقدر ہے.

یہ سب کے سب واقعات حضرت اقدس مسیح موعودؑ کے زمانے کے ہیں. اسی طرح یہ ظاہر ہوئے ہیں اور ایسے واضح ہیں کہ ان کی کوئی اور تفسیر ہو نہیں سکتی.

آگے انہی علامات کو جاری رکھتے ہوئے امام مہدی و مسیح موعود کی آمد کی پیش گوئی نقل کی جائے گی.

4- مسیح موعود کے زمانے کی علامات (حصہ دوم):

سورۃ مرسلات میں فرمایا ہے:

"اللہ کے نام کے ساتھ جو بے انتہا رحم کرنے والا، بن مانگے دینے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۔ قسم ہے پے بہ پے بھیجی جانے والیوں کی۔ پھر بہت تیز رفتار ہو جانے والیوں کی۔ اور (پیغام کو) اچھی طرح نشر کرنے والیوں کی۔ پھر واضح فرق کرنے والیوں کی۔ پھر انتباہ کرتے ہوئے (صحیفے) پھینکنے والیوں کی۔ حجت یا تنبیہ کے طور پر۔ یقیناً جس سے تم ڈرائے جا رہے ہو لازماً ہو کر رہنے والا ہے۔ پس جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ اور جب آسمان میں (طرح طرح کے) سوراخ کر دیئے جائیں گے۔ اور جب پہاڑ جڑوں سے اکھیڑ دیئے جائیں گے۔ اور جب رسول مقررہ وقت پر لائے جائیں گے۔ کس دن کے لئے اُن کا وقت مقرر تھا؟ ایک فیصلہ کن دن کے لئے۔ اور تجھے کیا سمجھائے کہ فیصلہ کن دن کیا ہے؟ ہلاکت ہے اُس دِن جھٹلانے والوں پر۔ کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ہم بعد میں آنے والوں

کو اُن کے پیچھے لاتے ہیں۔ اسی طرح ہم مجرموں سے سلوک کیا کرتے ہیں... ہلاکت ہے اُس دِن جھٹلانے والوں پر۔ اس کی سمت چلو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ایسے سائے کی طرف چلو جو تین شاخوں والا ہے۔ نہ تسکین بخش ہے نہ آگ کی لپٹوں سے بچاتا ہے۔ یقیناً وہ ایک قلعہ کی طرح کا شعلہ پھینکتا ہے۔ گویا وہ جو گیا رنگ کے اُونٹوں کی طرح ہے۔ ہلاکت ہے اُس دِن جھٹلانے والوں پر۔"

یہ آیات بھی سورۃ تکویر میں بیان کردہ علامات کا تسلسل ہیں. جس کی تفصیل گزشتہ قسط میں بیان ہوئی ہے.

ابتدائی آیات میں تشبیہ اور استعارے کی زبان میں کلام کیا گیا ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں. فرمایا:

"قسم ہے پے بہ پے بھیجی جانے والیوں کی. پھر بہت تیز رفتار ہو جانے والیوں کی." یعنی یہاں جن چیزوں کا بیان مقصود ہے وہ پہلے آہستہ اور پے در پے چلتی ہیں اور پھر بہت تیز رفتار ہو جاتی ہیں.

"اور اچھی طرح (پیغام کو) نشر کرنے والیوں کی۔ پھر واضح فرق کرنے والیوں کی۔ پھر انتباہ کرتے ہوئے (صحیفے) پھینکنے والیوں کی۔ حجت یا تنبیہ کے طور پر۔" یعنی پھر یہ واضح فرق کرتے ہوئے پیغامات بھی نشر کرتی ہیں اور وارننگ جاری کرتے ہوئے صحیفے بھی پھینکتی ہیں تا کہ حجت تمام کریں یا متنبہ کر دیں.

غور کریں کیا جنگی طیاروں کا اس سے بہتر نقشہ کھینچا جا سکتا ہے؟ کیا عالمی جنگیں اسی منظر کی عکاسی نہیں کرتیں؟ چنانچہ پہلے طیارے آہستہ اور ایک دوسرے کے پیچھے روانہ ہوتے اور پھر بہت رفتار پکڑ لیتے. جنگ سے قبل مختلف علاقوں میں امتیاز کرتے ہوئے پمفلٹ پھینکے جاتے تھے تا کہ وارننگ جاری کر کے اتمام حجت کر دی جائے.

"جس بات کا وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ لازماً ہو کر رہنے والی ہے." وعدہ کیا ہے اور کب پورا ہو گا؟ فرمایا جب ستارے ماند پڑ جائیں گے اور آسمان میں شگاف ہو جائیں گے اور پہاڑ جڑوں سے اکھیڑ دئے جائیں گے تب یہ وعدہ پورا ہو گا. یہ سب وہی علامات ہیں جن کی تفصیل پیچھے بیان ہوئی تھی اور ان کا مجازی ہونا بھی ثابت کیا گیا تھا.

جیسا کہ بیان ہوا تھا، ستارے ماند پڑنے سے مراد علماء ربانی کا ختم ہونا ہے. آسمان پھٹنے کا محاورہ ہماری طرح عربوں میں بھی مصائب وارد ہونے کیلئے استعمال ہوتا تھا. پہاڑ اکھڑنے سے مراد حقیقی طور پر پہاڑوں کی توڑ پھوڑ بھی ہے جیسا کہ اس زمانے میں ہو رہا ہے اور مجازی طور پر بڑی بڑی سلطنتوں کا زوال بھی مراد ہے.

اگلی آیت بہت اہم ہے کیونکہ وہ ان تمام علامات کا منتہا بیان کرتی ہے. فرمایا"اور جب رسول مقررہ وقت پر لائے جائیں گے. کس دن کیلئے ان کا وقت مقرر تھا، ایک فیصلہ کن دن کیلئے." یعنی جب تم یہ سب علامات پوری ہوتے دیکھو تو سمجھ لو کہ رسولوں کی آمد کا زمانہ آگیا تا خدا مومنین اور منکرین میں فیصلہ فرمادے. یہ امام مہدی / مسیح کے آنے کی خبر ہے. کیونکہ:

اول، سیاق وسباق اس واقعہ کو آخرت کی جانب منسوب کرنے میں مانع ہے. کیونکہ اس آیت سے قبل جدید زمانے کی ایجادات کا ذکر فرمایا ہے اور پھر اسی زمانے میں اسلام کے زوال کا ذکر بھی فرمادیا. نیز، اس آیت کے بعد فرمایا کہ جیسے پہلی قومیں خدائی طبیب کو جھٹلانے کے سبب مرض الموت کا شکار ہوئیں ویسے ہی آئندہ بھی منکرین اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالتے رہیں گے. یہ وہی سنت اللہ ہے جس کے متعلق سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا، وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿16﴾ یعنی جب تک رسول مبعوث نہ ہو، قوم پر عذاب نہیں آیا کرتا. یہ قانون بھی دنیا سے متعلق ہے، آخرت سے نہیں. لہٰذا اگر ان آیات میں رسولوں کا دنیا کی بجائے میدان محشر میں آنا مراد ہوتا تو اس کے فوراً بعد دنیاوی قانون کے بیان کا کیا موقع تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہاں دنیاوی بعثت ہی مراد ہے.

دوم، یہ بھی یاد رہے کہ رسول ہمیشہ دنیا میں ہی مبعوث کئے جاتے ہیں جبکہ آخرت تو حساب کا دن ہے.

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں رسل جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے پھر ایک رسول کا آنا کیسے مراد ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ رسل کا لفظ واحد پر بھی اطلاق پاتا ہے. دیکھیں: سورۃ ہود آیت 60 اور سورۃ فرقان آیت 38. سورۃ ہود میں فرمایا، "اور یہ قوم عاد ہے۔ انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی." اس پر غامدی صاحب فرماتے ہیں:

"اُن کی طرف اگرچہ ایک ہی رسول کی بعثت ہوئی تھی، مگر کوئی رسول بھی یہ دعوت اُن کے سامنے پیش کرتا، اُس کے ساتھ وہ یہی کرتے، اِس لیے ایک رسول کی نافرمانی کو تمام رسولوں کی نافرمانی قرار دیا ہے۔"

ایسی ہی غرض یہاں ہے کیونکہ دنیا کے بیشتر مذاہب ایک موعود کے منتظر تھے. مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ میں اس کا لقب مسیح ہے. ہندو اسے کرشن اور بدھ بدھا کے لقب سے موسوم کرتے ہیں، بعینہ دیگر مذاہب ہیں. ظاہر ہے یہ سب ایک ہی وجود کے نام ہیں جس کے متعلق امام باقر نے فرمایا کہ مہدی اپنی آمد تمام انبیاء کی آمد قرار دے گا. چنانچہ اسی غرض سے اس موعود کیلئے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے.

بعد کی آیات میں مامور من اللہ کے انکار کے نتائج بیان فرمائے گئے ہیں. فرمایا، اس دور میں منکرین کو تین شعبوں والے سائے کا سامنا ہو گا. ہمارے نزدیک اس سے مراد افواج کے تین شعبے یعنی بری، بحری اور فضائی ہیں. جو خشکی سے بھی جنگ مسلط کریں گے اور سمندر سے بھی. آسمان سے بھی آگ برسے گی اور کوئی صورت فرار کی نظر نہ آئے گی. اگلی آیات اسی تشریح کی تائید میں ہیں، فرمایا یہ قلعہ جیسے بڑے اور بلند شعلے پھینکیں گی جو جو گیا رنگ کے اونٹوں کی مانند ہوں گے.

آج ہم سب خدا کے فضل سے ان پیش خبریوں کے پورا ہونے پر قرآن مجید کی صداقت کے گواہ ہیں.

باب پنجم: آیت خاتم النبیین

قرآن مجید واضح طور پر حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع میں نبیوں کا آنا جائز رکھتا ہے. نیز، ایک موعود کی پیش گوئی بھی فرماتا ہے. مندرجہ ذیل آیات اسے قطعیت سے ثابت کر دیتی ہیں:

(۱) ﴿الأعراف:36﴾ - باب دوم

(۲) ﴿النساء:70﴾ - باب دوم

(۳) ﴿آل عمران:82﴾ - باب دوم

(۴) ﴿الحج:76﴾ - باب دوم

(۵) ﴿الجمعة:4﴾ - باب چہارم

(۶) ﴿هود:18﴾ - باب چہارم

(۷) التکویر و المرسلات - باب چہارم

ان ابواب میں ہمارے موقف پر عرفان شہزاد صاحب کی تنقید کا تفصیلی جواب خود ان کی تفاسیر سے دیا گیا ہے. یعنی اصلاحی و غامدی صاحب کے اپنے الفاظ ہمارے موقف کی تائید میں ہیں.

اس موضوع پر قرآن مجید کا موقف واضح ہو جانے کے بعد اب ہم آیت خاتم النبیین کی درست تفسیر قارئین کے سامنے رکھتے ہیں. نیز، غامدی صاحب کی تفسیر کی غلطی بھی واضح کئے دیتے ہیں. سورۃ احزاب آیت 41 میں ارشاد فرمایا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿الاحزاب:41﴾

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے. (تدبر قرآن)

اس آیت مبارکہ کی تفہیم میں جس لفظ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ لٰكِنْ ہے جس کا ترجمہ "بلکہ" کیا گیا ہے. یہی حرف تمام نزاع کا فیصلہ کر دیتا ہے اور کسی غیر متعلقہ معنی کیلئے راہ نہیں چھوڑتا.

لٰكِنْ حرفِ استدراک کہلاتا ہے. جس کا مطلب ہے کہ لٰكِنْ سے دو متضاد باتیں اس طرح متصل کی جاتی ہیں کہ پہلی بات سے پیدا ہونے والا شبہ، دوسری بات سے رفع کیا جاتا ہے. مثلاً:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴿آل عمران:180﴾

اور اللہ کی سنت نہیں کہ تم سب کو غیب کی خبریں دے دے بلکہ اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے (تاکہ اسے غیب کی خبریں دے).

دیکھیں یہاں لٰكِنْ سے دو متضاد باتیں جوڑی گئی ہیں. پہلے جملے میں فرمایا کہ اللہ غیب کی خبریں نہیں دیتا تو دوسرے جملے میں فرمایا وہ غیب کی خبریں دیتا ہے. نیز، پہلے جملے سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید اللہ کسی کو بھی غیب کی خبریں

نہیں دیتا. دوسرے جملے میں اس کا ازالہ فرمادیا کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ اس مقصد کیلئے اپنے رسولوں کو منتخب کرتا ہے.

اب آیت خاتم النبیین کی طرف آتے ہیں. سب سے پہلے وہ حالات ملاحظہ فرمائیں جس میں یہ آیت نازل ہوئی:

جب آنحضرتؐ کے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو آنحضرتؐ نے ان سے شادی کر لی. اس سے مخالفین نے طوفان کھڑا کر دیا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے شادی کر لی ہے. اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محمد ﷺ کی بہو کہاں سے ہونے لگی؟ جبکہ وہ تو تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ ہی نہیں ہیں. سو تم کس بنا پر اعتراض کر رہے ہو؟

اب دیکھتے ہیں کہ اس آیت پر حرف استدراک کا اطلاق کس طرح ہوتا ہے. فرمایا:

"محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں."

اول، ہمیشہ دو متضاد باتیں لٰکِنۡ سے جوڑی جاتی ہیں. اس لئے اگر پہلے جملے میں آنحضرتؐ کے باپ ہونے کی نفی کی گئی ہے تو دوسرے جملے میں لازماً آپؐ کے باپ ہونے کی تصدیق ہونی چاہئے. لیکن یہاں تو دوسرے جملے میں فرمایا کہ آنحضرتؐ رسول اللہ اور خاتم النبیین ہیں. سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "باپ نہ ہونا" اور "رسول ہونا" ایک دوسرے سے متضاد کیسے ہیں؟ چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں "رسول اللہ" کے الفاظ سے امتیوں کا باپ اور "خاتم النبیین" سے نبیوں کا باپ ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے. یعنی آیت کا مدعا یہ ہے کہ آنحضرتؐ کسی مرد کے جسمانی باپ نہیں بلکہ روحانی باپ ہیں امتیوں کے بھی اور نبیوں کے بھی. اس لئے "خاتم النبیین" کی جو بھی تفسیر کی جائے، اسے اِس اصولی مفہوم کی تائید میں ہونا چاہئے نہ کہ اس کے برخلاف. بہت سے مفسرین نے حرف استدراک کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی تفسیر بیان کی ہے اور مولانا قاسم نانوتوی نے اپنی کتاب "تہذیر الناس" میں اس پر تفصیلاً بحث کی ہے.

دوم، پہلے جملے سے کیا شبہ پیدا ہوتا تھا جو رفع کیا گیا ہے؟ کیونکہ حرف استدراک کا بنیادی مقصد تو یہی ہوتا ہے. چنانچہ فرمایا:

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں یعنی آپؐ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے. دراصل عرب کلچر میں نرینہ اولاد کا نہ ہونا کمتر بلکہ ابتر ہونا سمجھا جاتا تھا، اور قرآن مجید گواہ ہے کہ آپؐ کو ابتر ہونے کا طعنہ بھی دیا جاتا تھا. (ابتر: وہ شخص جس کی نسل منقطع ہو جائے اور کوئی اس کا نام لیوا نہ رہے.) اس کے جواب میں آنحضرتؐ کی عظمت بیان فرمائی ہے کہ اگر آپؐ کسی مرد کے باپ نہیں تو اس میں ابتر ہونے کی کیا بات ہے؟ کیونکہ:

(۱) آپؐ اللہ کے رسول ہیں جس سے ایک طرف آپؐ کے نام لیوا روحانی اولاد کے طور پر ہمیشہ موجود رہیں گے جبکہ دوسری طرف سورۃ کوثر کی پیش گوئی کے مطابق آپؐ کے دشمنوں ابوجہل، عاص اور ولید کی نسل ختم کی جائے گی جو خود کو آنحضرتؐ سے منسوب کر کے آپؐ کی ہی اولاد میں شامل ہو جائے گی.

(۲) آپؐ خاتم النبیین یعنی نبیوں کی مہر بھی ہیں. یعنی اب قیامت تک صرف وہی شخص نبی ہو پائے گا جس پر اِس مہر (آنحضرتؐ) کی چھاپ ہو. اور یہ کامل اطاعت ہی ہے جو آنحضرتؐ کی چھاپ کسی شخص میں پیدا کرتی ہے. لہٰذا نہ صرف آپؐ کی روحانی اولاد جاری رہے گی بلکہ آئندہ نبی بھی صرف انہی میں سے آئیں گے اور آپؐ ان کیلئے باپ کی طرح ہیں. اس لئے ابتر ہونا تو بہت دور کی بات ہے، آنحضرتؐ کو تو وہ درجہ عطا ہوا ہے جو کبھی کسی نبی کے حصے میں نہیں آیا. اسی بات کو سورۃ نساء میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ اور اس رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ نبیوں میں شامل ہو جائے گا (دیکھیں باب دوم).

پس اگر خاتم النبیین کے یہ معنی کیے جائیں کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آسکتا. تو یہ آیت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے، سیاق وسباق سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا اور حرف استدراک بے جا قرار پاتا ہے. نیز، ابتر ہونے کا اعتراض جس کا سورۃ کوثر میں ذکر کیا گیا ہے، پختہ ہو جاتا ہے.

چنانچہ ان آیات میں آنحضرتؐ کی فضیلت کا بیان ہے جس کی مزید تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرتؐ نے دوسرے انبیاء پر اپنی ایک فضیلت خاتم النبیین ہونا بیان فرمایا ہے. سو، خاتم النبیین کا لقب فضیلت کا لقب ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ آخر پر آنے اور کسی نعمت خداوندی کو ختم کر دینے میں کوئی فضیلت نہیں ہوتی. نیز، عربوں میں خاتم کا لفظ فضیلت کے معنوں میں ہی مقبول ہے. چنانچہ کلام عرب میں خاتم الشعراء، خاتم الأولیاء، خاتم الأطباء وغیرہ کا محاورہ عام پایا جاتا ہے. نہ یہ لفظ "آخری" کے معنوں میں کبھی مقبول ہوا اور نہ آج تک کوئی عربی دان اسے آخری کے متبادل لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے.

غامدی صاحب کی تفسیر:

مودودی اور غامدی صاحب اس آیت کی تفسیر میں کفار کی جانب سے اٹھائے گئے دو اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) ان کا اعتراض تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنی بہو سے شادی کر لی ہے.

(۲) ان کا دوسرا اعتراض تھا کہ متبنی کی مطلقہ سے متعلق شریعت بیان کر دی لیکن کیا ضروری تھا کہ آنحضرتؐ اس پر عمل کرتے ہوئے حضرت زینب سے شادی بھی کر لیں؟ یعنی یہ مثال قائم کرنا ضروری کیوں تھا؟

چنانچہ غامدی صاحب کے نزدیک لٰکِنۡ سے اسی دوسرے شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ چونکہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، اس لئے یہ ذمہ داری آپؐ نے ہی ادا کرنی تھی. اور رسولوں سے ایسے کام پہلے بھی لئے گئے ہیں. اور پھر آپؐ خاتم النبیین یعنی آخری نبی بھی ہیں، اس لئے یہ مثال قائم کرنا آئندہ کیلئے موخر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا.

اول، اس بات کو سمجھ لیجئے کہ اگرچہ قرآن مجید اس شادی کا مقصد مومنین کیلئے مثال قائم کرنا بیان کرتا ہے لیکن اس دوسرے اعتراض کی طرف اشارہ تک نہیں کرتا. بلکہ قرآن مجید اور تاریخ دونوں سے ثابت ہے کہ معترضین کی جانب سے واحد اعتراض یہ اٹھایا گیا تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنی بہو سے شادی کرلی ہے. ان کی جانب سے ایسا کوئی اعتراض کیا ہی نہیں گیا تھا کہ مثال قائم کرنا کیوں ضروری تھا؟ اس بات کا اعتراف ناقد صاحب کو بھی ہے. سو یہ دوسرا اعتراض ایک فرضی اعتراض ہے جو بلا ثبوت ہے اور اپنی تفسیر درست ثابت کرنے کیلئے ان صاحبان کی طرف سے بیان کیا گیا ہے.

دوم، لٰکِنۡ سے صرف اُس شبہ کا ازالہ کیا جاتا جو اِس سے پہلے لکھے جملے سے پیدا ہوتا ہے. ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کوئی بھی شبہ فرض کریں اور اسے لٰکِنۡ کے اطلاقات میں داخل کر دیں. لہٰذا ان حضرات کی طرف سے دوہری غلطی کی گئی ہے کہ ایک تو فرضی اعتراض بنایا اور پھر اسے بے محل جڑنے کی کوشش بھی کی.

سوم، اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ یہ دوسرا اعتراض بھی کیا گیا تھا تب بھی یہ کیا جواب ہوا کہ چونکہ آپؐ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں، اس لئے آپؐ کیلئے یہ شادی کرنا ضروری تھی؟ اس جواب کے منطقی مغالطے کو نظر انداز کر دیں تب بھی ہر شخص جانتا ہے کہ دعوٰی دلیل نہیں ہوا کرتا. معترضین کیلئے آنحضرتؐ کی نبوت ورسالت ایک دعوٰی تھا، ان کیلئے اسے دلیل بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا. یعنی جو بات ثابت کرنی ہے، اُسی کو ثبوت کے طور پر بیان کیا

جارہاہے۔ اور پھر یہ کہنا کہ پہلے رسول بھی تو ایسا کرتے رہے ہیں، اس بات کی دلیل نہیں کہ جو بھی ایسا کرے، لازماً رسول ہو جائے گا۔ ایسی تفاسیر نہ صرف منطق اور لسانی قواعد کے خلاف ہیں بلکہ ان سے آنحضرتؐ کی ہتک بھی ہے۔

اب آتے ہیں لفظ "خاتم" کی طرف، اس کے معنی پر بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ غامدی صاحب بھی اس کا مطلب "مہر" ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے ان کے کچھ مغالطوں کا جواب ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مہر کے دو ہی کام ہوتے ہیں، ایک تصدیق کرنا اور دوسرا کسی چیز کو بند کرنا۔ اگر اس آیت میں مہر بند کرنا مراد لیا جائے تب تو بات بالکل واضح ہے کہ نبوت ختم ہو گئی۔ اور اگر مہر کو تصدیق کے معنوں میں لیا جائے تو کوئی بھی شخص اپنی نبوت کے محضر پر آنحضرتؐ کی مہر کہاں سے دکھا سکتا ہے؟

اس پر عرض ہے کہ کیا "خاتم النبیین" سے یہ مراد ہے کہ آنحضرتؐ کے پاس لوہے لکڑی کی کوئی مہر ہے؟ ہر گز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو خود آپؐ کو ہی مہر قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کو مہر کہا جائے گا تو اس کی چھاپ کسی کاغذ پر تو نہیں ہو سکتی۔ اور پھر نبوت کا محضر (کاغذ) کون سا ہوتا ہے؟ انبیاء کے پاس اپنی صداقت کیلئے کوئی مہر لگا کاغذ نہیں ہوا کرتا بلکہ تمام دلائل و براہین ان کی ذات سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ اس لئے تصدیقی معنوں سے مراد یہ نہیں کہ کسی "کاغذ" پر "آنحضرتؐ کی مہر" کی چھاپ ہو بلکہ یہ مراد ہے کہ خود "آنحضرتؐ" کی چھاپ کسی "شخص" پر ہو۔ اور یہ کامل اطاعت ہی ہے جو آنحضرتؐ کی چھاپ کسی شخص میں پیدا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت آپؐ کی اتباع کرنے والوں میں ہی رکھ دی گئی ہے۔

جہاں تک مہر بند کرنے کے معنوں کا سوال ہے، ہم واضح کر چکے ہیں کہ سیاق و سباق اسے قبول نہیں کرتا۔